علمی، تحقیقی ادبی فکروں کا بے باک ترجمان

ماہنامہ

الماس ممبئی

مدیر

مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی

معاون مدیر

مولانا حفظ الرحمن اعظمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علمی، ادبی اور تحقیقی فکروں کا ترجمان

ماہنامہ الماس ممبئی

جلد نمبر: ۱ ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ مطابق اگست ۲۰۲۱ء شمارہ نمبر: ۳

ناشر: ادارہ فکروفن، **انوار جامع مسجد**، شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی، انڈیا

Mobile: 8767438283, 7905452498, 9336482291

Email: sharfuddinazim@gmail.com, theazmivlog@gmail.com

اس شمارے میں

آئینہ ایام

مدیر

یوم آزادی:

پندرہ اگست کی تاریخ ملک عزیز کے لئے یادگار اورقومی دن ہےاسی تاریخ میں ہندوستان کوصدیوں کے برطانوی سامراج سے نجات ملی، غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں اورآزادی کی دولت نصیب ہوئی، اس کی یاد میں ہرطرف جشن کی محفلیں برپا ہوتی ہیں، چراغاں کیا جاتا ہے، آزادی کے نغموں سے پورے ملک کی فضائیں پرشور ہوجاتی ہیں۔

لیکن ہرانصاف پسند اچھی طرح جانتا ہے کہ مسرتوں کے یہ مظاہر محض رسمی اعمال کے سوا کچھ نہیں ہے، اس کا تعلق وہ سرشاری اوروہ سرمستی جودل کے نہاں خانے سے پھوٹتی ہے قطعا نہیں ہے، جس ملک میں نفرتوں کی سوداگری عروج پر ہو، تعصّبات کی آندھیاں شباب پر ہوں، نشہ اقتدار میں حکومت جہاں ایک طبقے کے خلاف نفرت وتعصب کی روش پر چل رہی ہو، جہاں عالمی وبا میں بھی مخصوص طبقے کونشانہ بناکر پسماندگی کے سمندر میں غرق کرنے کے لئے ساری طاقتیں صرف کی جارہی ہوں، وہاں ایسی آزادی درحقیقت کوئی معنی ہی نہیں رکھتی ہے، ایسے وقت میں ضرورت ہے کہ ان مسلم مجاہدین کی قربانیوں کو منظر عام پر لایا جائے اوراس کے ذریعے بتایا جائے کہ اس ملک کی حفاظت میں سب زیادہ قربانیاں مسلم رہنماؤں کی رہی ہیں، تاکہ مسلمانوں کے سرفروشانہ کردار جنہیں منظم انداز میں حکومتی سطح پر گمنامی کے اندھیروں میں ڈالا گیا ہے ان کی حقیقتوں سے پردہ اٹھے اور برادران وطن کے اذہان میں اس حوالے سے منفی اثرات کا ازالہ ممکن ہوسکے، اورمسلمانوں کے تئیں مثبت جذبات پیدا ہوں، آزادی کی راہ میں مسلمانوں کی تاریخ سازقربانیوں کی روشنی میں قوم وملت کے ساتھ ساتھ ملک کے تحفظ کے لئے

مزید موٴثر منصوبہ بندی اور ملت کے زوال کے اسباب کی دریافت وقت کی اہم ضرورت اور تقاضا ہے۔

عوامی آزادی پر اقتدار کا حملہ:

بھارت ایک جمہوری ملک ہے، اس ملک کا ہر فرد خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو، کسی بھی کمیونٹی کا ہو یا کسی بھی طبقے کا، داخلی معاملات میں وہ آزاد ہے، نجی معاملات اور ذاتی کردار اور پوشیدہ احوال و کیفیات میں آزادی اس کا دستوری حق ہے، اس حق پر عام حالات میں کسی بھی قسم کی مداخلت اور جاسوسی جہاں گھناؤنا عمل اور پرائیویسی پر بدترین حملہ ہے وہیں ملک کے دستور و آئین کا بھی خون ہے۔

مگر حالیہ دنوں میں عالمی دہشت گرد اسرائیل کے تعاون سے یہ غیر جمہوری عمل اور شرمناک حرکت انتہا پسند حکومت کی طرف سے بھارت میں منظم طریقے سے کی گئی ہے۔اور ملک کی سیاسی، سماجی، اور اپنے فرائض کو دیانت دارانہ انداز میں انجام دینے والی صحافت سے وابستہ شخصیات کی جاسوسی کی گئی ہے۔

دنیا میں سب سے پہلے یہ شرمناک حرکت شام اور لبنان کے خلاف اسرائیل نے ہی کر کے کھلی دہشت گردی کا ثبوت دیا تھا، اور فلسطینی، شامی، لبنانی کی جاسوسی کے لیے اس کی تنظیم این، ایس، او نے پیگاسس نام سے اسپائی وئیر بنا کر اپنے مخالفین کی پرائیویسی پر حملے کا آغاز کیا تھا۔

اسرائیل نے نہ صرف یہ کہ اس ایپ کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا بلکہ اسے پچاس ملکوں کو یہ کہ فروخت بھی کیا کہ اس کے ذریعے دہشت گردی کے انسداد میں آسانی ہوگی، جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی، اصل مقصد یہ تھا کہ اس ایپ کے ذریعے سیاسی حریفوں، اور اپنے نظریاتی مخالفین کی جاسوسی کی جاسکے، موجودہ بھارتی حکومت انتہاپسندی میں بالکل اسرائیل ہی کے نقش قدم پر چل رہی ہے یہی وجہ ہے کہ تل ابیب سے اس کے تعلقات نہایت گہرے اور مضبوط ہیں جب کہ ہند کی روایت اور یہاں کی حکومت کی پالیسی ہمیشہ اسرائیل کے خلاف رہی ہے۔

انڈیا میں اسرائیلی ایپ کے ذریعے جاسوسی کا پردہ فاش ہوا، اور پارلیمنٹ میں حزب اختلاف نے سوال کیا کہ حکومت کی اجازت کے بغیر کیونکر اسرائیل نے یہ گھناؤنا قدم اٹھایا، حکومت کی طرف سے جواب میں مسلسل اب تک خاموشی ہی رہی، پارلیمنٹ کا اجلاس اس قضیہ کی وجہ سے دوبار ملتوی ہوا مگر حکومت صفائی دینے پر آمادہ نہیں ہے، یہ طرز عمل واضح ثبوت ہے کہ اس اقتدار نے بھی اس ایپ کو خریدا ہے تاکہ اس کے ذریعے عوام کی پرائیویسی اور اس کی ذاتی معلومات پر قبضہ کر کے اسے اپنے سیاسی مفادات میں استعمال کیا جا سکے۔

ایسی صورت میں ملک کی تمام تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کو متحد ہو کر اس شرمناک اور غیر انسانی کردار کی مخالفت کرنی چاہیے، ورنہ انتہا پسندی کا یہ عفریت ایک اک کر کے پورے ملک کو نگل لے گا۔

ہیومن رائٹس واچ کا دہرا معیار:

فلسطین کے ساتھ اسرائیل کا جارحانہ رویہ اور اس کے مظالم کی داستان ستر سالوں پر پھیلی ہوئی ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کو طاقت وقوت کے زور پر فلسطین پر بسایا گیا ہے اور پھر اس کے بعد مسلسل وہ فلسطینی سرزمین پر قبضہ کرتا رہا ہے مئی ۲۰۲۱ء میں شیخ الجراح کے علاقہ پر بھی اس نے ظالمانہ قبضے کی کوشش کی اور اہل فلسطین کو ان کے گھروں سے جبراً نکالنے کا جرم کیا، حماس کی طرف سے مزاحمت ہوئی، جس پر اسرائیل نے میزائلوں سے حملہ کیا، یہ سراسر اسرائیل کا بدترین جرم تھا، حماس نے بھی اپنی طاقت کے بقدر جوابی کارروائی کی، اسرائیل کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج ہوا، جنگ بندی ہوئی، اقوام متحدہ کی طرف سے اسرائیل پر جرمانہ عائد ہونا چاہیے تھا مگر دنیا کا دستور ہے کہ یہاں سارا انصاف مادی طاقت وقوت کے زیر اثر ہے۔

اس کی ایک بدترین مثال ۲۷/ جولائی ۲۰۲۱ء کو ہیومن رائٹس واچ یعنی عالمی انسانی حقوق کی تنظیم کی طرف سے سامنے آئی ہے جس میں اسرائیل کے ساتھ ساتھ حماس کو بھی جنگ کا مجرم قرار دیا ہے، یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کمزوروں اور خاص طور سے اہل اسلام کے

لئے انصاف وعدالت کے پیمانے الگ ہیں، کہ اپنے ملک اور اپنی زمین کی حفاظت کے لئے مزاحمت جنگی جرم اور مادی قوتوں سے لیس قوموں کے غاصبانہ وظالمانہ جرائم بھی انصاف کے عین مطابق، اس دہرے معیار سے عیسائیت کی اسلام دشمنی اور اس کے ذریعے انسانیت کے استحصال کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

دہلی ہائی کورٹ کا غیر جمہوری تبصرہ:

حالیہ دنوں میں دہلی ہائی کورٹ میں غیر مسلم فیملی کا طلاق کے سلسلے میں مقدمہ دائر ہوا، جس میں شوہر نے طلاق دی ہے مگر اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق جس مذہب اور روایت سے اس میں اس طریقہ کار کی گنجائش نہیں ہے، کورٹ کو چاہیے تھا کہ عورت کے مذہب اور عائلی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتی، مگر اس فرض کو نظر انداز کر کے برہمنی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے نہ صرف یہ کہ اس نے یونیفارم سول کوڈ کی حمایت کی بلکہ اس کے نفاذ کے لئے حکومت کے پاس تجویز بھی بھیج دی، چنانچہ جسٹس پرتیبھا ایم سنگھ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ ملک مذہب، ذات پات اور برادری سے اوپر اٹھ چکا ہے جدید ہندوستان میں مذہب، ذات پات اور برادری کے باندھ تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، تیزی سے ہورہی اس تبدیلی کی وجہ سے بین المذاہب اور ذات پات کے درمیان شادی پھر علیحدگی یعنی طلاق میں خاصی دقتیں آرہی ہیں، اس لحاظ سے ملک میں یونیفارم سول کوڈ نافذ ہونا چاہیے تاکہ آج کی نوجوان نسل ان پریشانیوں میں مبتلا نہ ہو۔

یہ تجویز موجودہ ہندوستان کے تناظر میں جس قدر سنگھی ذہنیت کی عکاس ہے اسی قدر مضحکہ خیز بھی، فرقہ پرستی اور تعصب عناد کا جنون جب اقتدار کے ساتھ ساتھ انصاف کے مندروں پر بھی مسلط ہوجائے تو پھر اس ملک کی سلامتی کا خدا ہی محافظ ہے، ایسی صورت میں ملک وقوم کے سب سے باوقار منصب کا بھی پاس ولحاظ نہیں رہ جاتا اور اس کے بنیادی فرائض بھی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں، اور زمینی حقائق سے آنکھیں بند کر کے اسی طرح کے غیر جمہوری تبصرے سامنے آنے لگتے ہیں۔

اس ملک میں ہر فرد کو اپنے عائلی قوانین پر عمل کرنے جمہوری آزادی ہے اس میں مداخلت درحقیقت انسانوں پر جبر واستبداد ہے جو انگریزی دور میں بھی نہیں تھا، ایسے ملک میں جہاں سیکڑوں کی تعداد میں مذاہب اور برادریاں ہیں، کیا وہ ایسے قانون کو تسلیم کرلیں گے؟ جبراً لوگوں کو خودساختہ قانون پر لے آنا جہاں جمہوریت سے انحراف ہے وہیں بدترین ڈکٹیٹ اور سراسر ظلم بھی ہے، جو ملک کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔

ان جسٹس سے کوئی سوال کرلے کہ ملک اگر مذہب اور ذات پات سے اوپر اٹھ چکا ہے تو پھر رام مندر کے لئے اس قدر خون خرابہ کیوں ہے، گئوکشی کے نام پر مآب لینچنگ کیوں ہے، شہریت ترمیمی ایکٹ کی ضرورت فاسسٹ حکومت کو کیوں پیش آئی، کیا وجہ ہے کہ ملک کی تاریخی مساجد فرقہ پرستوں کے نشانے پر ہیں، تو لازمی ہے کہ ان کے پاس سوائے سکوت کے اور کوئی جواب نہیں ہوگا۔

مسلم بچیوں کا ارتداد:

آج ایک ویڈیو کلپ سامنے آئی ہے جس میں متعدد مسلم بچیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ نکاح کے فارم تھے اور دونوں کی ان کا غذات میں تصویریں بھی ہیں، اس وقت منصوبہ بند طریقے سے انتہا پسند تنظیموں کی طرف سے یہ مہم چلائی گئی ہے کہ مسلم لڑکیوں کو دام فریب میں مبتلا کرکے ان سے شادیاں کی جائیں اور انہیں ہندو بنایا جائے، اس کے لئے باضابطہ نوجوانوں کی ٹیم بڑے پیمانے پر تشکیل دی گئی ہے، اور پورے ملک میں نادان اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف لڑکیاں خاص طور سے کالج واسکول کی طالبات اس فریب میں مبتلا ہوکر دنیا بھی تباہ کررہی ہیں اور آخرت بھی، ملک کی گودی میڈیا سے لیکر سنگھی صحافیوں کا کردار بھی اہتمام سے اس میں ملوث ہے، ملک میں کہیں بھی کسی غیر مسلم لڑکی سے اگر کوئی مسلم لڑکا نکاح کرلے اور نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے اہل خانہ کی رضامندی بھی اس میں شامل ہوتو بھی میڈیا آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے، اور لو جہاد کے نام پر نفرتوں کے شعلے ہر طرف پھیلا دیتی ہے، علماء ودانشوروں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا جاتا ہے، لیکن یہی چیز جب برعکس صورت میں معاشرے میں رونما

ہوتی ہے اورلڑکی مسلم ہوتی ہےتو میڈیا کا بھی انداز بدل جاتا ہے، اور ہندی صحافیوں کی بھی زبان دوسری ہوجاتی ہے،ذیل میں اس کی مثال دیکھیں جو ۳۰/جون کی رپورٹ میں سنتوش صحافی کےقلم سے ہے،۳۰/جون کو نیوز ۱۸/ کےسنتوش گپتا نے ایک ہندی رپورٹ شائع کی۔اس رپورٹ کی ابتدااس طرح کی گئ۔۔۔۔پیارا اگرسچا ہوتو دھرم اور مذہب کی دیوار منزل کو پانے سے نہیں روک سکتی۔ایسا ہی ایک معاملہ بہار کے چھپرا میں سامنے آیا ہے جہاں معاشرہ کی قدامت پرستی کوتوڑتے ہوئے روبینہ خاتون نے انکت کمار کا ہاتھ تھام لیا اور مندر میں جا کر شادی رچالی۔اس شادی کوسوسائیٹی کی منظوری بھی مل گئ کیونکہ دونوں ہی دھرموں کے لوگوں نے نو بیاہتا جوڑے کو نیک خواہشات پیش کیں۔بھیلدی (جہاں یہ واقعہ ہوا) میں الگ الگ دھرم ہونے کے باوجود شادی کرنے والے اس جوڑے کولوگ آشیرواد دینے پہنچے اوردونوں کے خاندانوں نے بھی اس شادی کومنظوری دیدی۔

اس واقعہ سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ فرقہ پرستی اور انتہا پسندانہ نظریات کی جڑیں اس ملک میں کتنی گہری ہیں، ایسی صورت میں سوائے اس کےکوئی راستہ نہیں ہے کہ ملت اسلامیہ ہندتعلیمات اسلام کی طرف واپس آئے، دینی تعلیم کےساتھ عصری علوم کی طرف متوجہ ہو، اسلامی ماحول میں مسلم نو جوانوں کی تعلیم وتربیت کا منظم بندوبست کرے،اورسب سے بڑھ کرانفرادی طور پراپنی اولادکی تربیت اورذہن سازی اس قدرمضبوط انداز میں کرے کہ وہ زندگی کےکسی بھی مرحلے میں ایمان واسلام کا سودا کرنے کے لئےسوچ بھی نہ سکیں۔

❁❁❁❁❁

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

ڈاکٹر قاضی سراج اظہر

دوعالم کی محبوب ترین ہستی حضورِ اکرم سرورِ دوعالم ﷺ جن کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴:۴)

اور ہم نے بلند کیا آپ کا ذکر سبحان اللہ۔

قرآنِ حکیم میں یوں تو اور بھی پیغمبروں اور رسولوں کا ذکر موجود ہے مگر جہاں تک حضورِ اکرم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر، انکی قدرو منزلت اور اُنکی عظمت کو اس آیت کے نزول سے واضح کر دیا گیا ہے۔ ہم کو اس نظامِ ہستی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جو آپ کے درجے سے بلند ترین ہو۔ اسکی مزید تشریح مندرجہ ذیل آیت میں کُھلے طور پر بیان کردی گئ ہے۔

إِنَّ اللهَ وَمَلائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۳۳:۵۶)

بیشک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی پر دُرود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی اُن پر دُرود وسلام بھیجو۔

اس آیتِ کریمہ میں لفظ ''اِنَّ'' تاکید کیلئے استعمال ہوا ہے اور یقینِ کامل پر دلالت کرتا ہے اور ''یصلون'' صیغہ مضارع کے ساتھ عملِ دوام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں پر یہ واضح کردیا ہے کہ اس کے نزدیک پیارے نبی ﷺ کا کیا رتبہ ہے۔ یہ اللہ کے بندوں کیلئے حکمِ خداوندی ہے کہ وہ رسالت مآب ﷺ پر درودو سلام بھیجتے رہیں جس طرح اُنکا رب اور اسکے ملائیکہ نبیٔ رحمت ﷺ پر درود وسلام بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ امر اللہ کے نزدیک نہ صرف حُبِّ رسول اور محبوبیت کی دلیل پیش کرتا ہے؛ بلکہ میں سمجھتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نہ صرف ''وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ'' کی تشریح کی ہے بلکہ ربِّ جلیل نے حُبِّ رسول کی اہمیت اور اس کے تقاضے کو نہایت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ

پیش کیا ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے۔کیا کسی اور پیغمبر اور اللہ کے رسول کے لئے اسطرح کا حکم نازل ہوا؟ ظاہر ہے جواب نفی میں ہے۔اگر ہم کلمۂ طیبہ کی عبارت پر غور کریں گے تو پتہ چلے گا، لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدُالرَّسُوْلُ اللّٰهِ (نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے محمدؐ اللہ کے رسول ہیں)۔مومن کی پہچان صرف وحدانیت کا اقرار نہیں ہے؛ بلکہ ساتھ ہی محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار اور انکی اتباع لازمی جُز ہے۔یہی کامل ایمان کی دلیل ہے۔

یہ غور طلب بات ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کو اپنے کلمے کا حصہ بنا دیا؟ کئی جگہ اللہ کا فرمان ہے۔اللہ و رسولؐ کی اطاعت کی اہمیت بتانے کے لئے فرمایا گیا: قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ''کہئے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی''۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ''اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ''اور اطاعت کرو اللہ اور رسول کی اگر تم ایمان والے ہو''۔

دُخُولِ اسلام سے لیکر اذانوں میں ہماری نمازوں میں اور تقریباً تمام عبادات میں اللہ تعالی نے ذکرِ مصطفی صلی اللہ وعلیہ وسلم کو افضل ترین درجہ دے دیا ہے۔اس کرۂ ارض میں ایسا کوئی لمحہ نہیں جب آپ کا ذکر نہ ہو اور آپ پر درود وسلام نہ بھیجا جاتے ہوں۔یہاں تک کہ عالمِ بالا میں ملائکہ بشمول اللہ جل شانہٗ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وصلواۃ بھیجتے رہتے ہیں اور مومنین پر بھی یہ حکم صادر کر دیا گیا کہ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجتے رہیں۔

اس سے بڑھ کر آپکی فضیلت کیا ہوسکتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز تو اللہ تعالی کی تعریف و توصیف بیان کرتی ہے جیسا کہ کہا گیا وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ اور بیشک کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن اللہ تعالی اپنی شانِ کریمی کے ساتھ اپنے حبیبِ پاک کی حمد وثناء کو بھی لازم قرار دیتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی شخص اس

وقت تک مومن نہیں جب تک میں اس کو اس کے والد سے اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہو جاؤں''۔ (صحیح بخاری: کتاب الایمان)۔

علامہ اقبال بہت ہی خوبصورت ڈھنگ سے جوابِ شکوہ میں ربِّ ذوالجلال کی جانب سے رسالت مآب ﷺ سے عشق کی سطح کا تعلق کچھ اسطرح بیان کرتے ہیں۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حُبِّ رسول ﷺ ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔اسی میں دُنیا وآخرت کی کامیابی مضمر ہے کہ ہم حضور ﷺ کی اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنالیں۔حبیب اللہ سے جذبۂ الفت اور ایمانِ کامل کا یہی تقاضہ ہے۔ہم سنتِ نبوی کو اپنے آپ میں ڈھال لیں، ہمارے قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ آقائے دو جہاں ختم المرسلین ورحمت العالمین سے اگر ہمیں سچی عقیدت ومحبت ہے اور اگر ہم اسکے دعوے دار ہیں تو ہم اُنکی طرزِ زندگی کا نمونہ بن جائیں۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوستا
گر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

حضورِ اکرم ﷺ کی ذات تک خود کو پہنچادو [تاکہ مسلمان بن سکو۔۔۔کیوں کہ] اگر تم ان تک نہیں پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ باقی دنیا میں تو صرف بولہبی یعنی کفر ہی ہے۔

دل تو کہہ رہا ہے حُبِّ محبوبِ ﷺ الٰہی پر لکھتا ہی چلا جاؤں لیکن مضمون کی طوالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آخر میں میری نعت کا ایک شعر پیش کرنا چاہونگا۔

کچھ تو ایسا اپنے جینے کا قرینہ ہوگیا
جان مکّہ ہوگئی ہے دل مدینہ ہوگیا

لاکھ باتوں کی ایک بات ہے۔ہم اگر قربِ الٰہی چاہتے ہیں تو آپ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو اپنی زندگی کا شعار بنالیں۔

وأخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین والصلاۃ والسلام علي رسوله الکریم.

❁❁❁❁❁

درویش علم وادب مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی

شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی

انقلابات وحوادثات اس عالم فانی کا لازمی خاصہ ہیں، اس کا ہرلمحہ تغیر پذیراور ہر گھڑی حوادث آشنا ہے، کاروبار ہستی انہیں تغیرات وحادثات کے سایے میں چلتا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی یہ آندھیاں اس شدت سے ظاہر ہوتی ہیں کہ گلشن ہستی ویران ہوکررہ جاتا ہے۔

عصر رواں میں کرونا کی شکل میں اٹھنے والی موت کی بے رحم لہروں نے بھی بے شمار زندگی کے چراغ گل کئے، اوران گنت شاداب گلشنوں کوخزاں آشنا کرکے دنیا کی بےثباتی پر مہر ایقان ثبت کی ہے، موت کے اس طوفان کی زد میں جہاں اور بہت سے ادارے، درسگاہیں، اور ہنگام زندگی سے معمور دانشکدہ علوم وفنون آئے وہیں برصغیر کے ممتاز اسلامی ادارہ ازہر ہنددارالعلوم دیوبند نے بھی اس کی ہلاکت خیزیوں کے باعث مسلسل صدمات کا سامنا کیا ہے، مختصر مدت کے دوران جلیل القدر شخصیات اورقدآور ہستیوں کی اچانک رحلتوں کے باعث دارالعلوم دیوبند کے لئے حقیقت میں یہ سال موسم دردوالم ثابت ہوا ہے۔

چنانچہ حال ہی میں علم وادب کی دنیا کی ممتاز شخصیت مولانا نورعالم خلیل امینی اورفکر تحقیق کی قدآور ہستی حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ اورعلم وعمل کی جامع شخصیت حضرت مولانا قاری عثمان صاحبؒ کی رحلت کے باعث ذہن ودماغ کرب واضطراب کے حصار سے نکل نہیں پایا تھا کہ استاذ محترم حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی بھی مورخہ: ۳۰/جولائی ۲۰۲۱ء مطابق ۱۹/ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ بروز جمعہ اس جہان فانی کو خیرباد کہ کر عالم آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی پہلی زیارت کا شرف درجہ ہفتم کے سال دارالعلوم دیوبند میں ہوا، درمیانہ قدوقامت، چھریرا بدن، سفید رنگت، روشن چہرہ، آنکھوں پر عینک، سر پر سفید عربی رومال، گفتگو میں ٹھہراؤ، اور مخصوص آہنگ، سفید اور گھنی داڑھی، لہجے میں بلا کی نرمی اور کشش، سراپا سلف صالحین کا نمونہ۔

مولانا مرحوم سے ہفتم ہی کے سال ہدایہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ان کا درس بہت دلچسپ ہوتا تھا، وہ بہترین استاذ و مدرس تھے، اور بہت محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے، عبارت کی تشریح اور مسائل کی توضیح بڑے سلیقے سے کرتے تھے،لفظوں کی تحقیق اور عبارتوں کے اُسرار و رموز اور ان کے معارف وحقائق کو بہت پراعتماد اور دلنشیں انداز میں آشکارا کرتے تھے، درس نظامی کے تمام فنون پر انہیں دسترس حاصل تھی، اسی طرح ادب پر بھی انہیں عبور حاصل تھا، ان کے درس میں طلباء اہتمام سے حاضر ہوتے تھے، اور شوق وذوق کے ساتھ ان کی فقیہانہ وادیبانہ باتوں سے مستفید ہوتے اور ظریفانہ جملوں سے محظوظ ہوتے۔

مولانا مرحوم کو اردو عربی دونوں زبانوں پر خاصی قدرت تھی، انھوں نے تحریر میں تو بہت مختصر سرمایہ چھوڑا ہے؛ مگر جو کچھ ہے وہ نہایت قیمتی اور ادب کا نمونہ ہے، تدریسی زبان کے علاوہ عام گفتگو اور تبادلہ خیال میں بھی جس قدر فصاحت و بلاغت اور مرتب و مرصع جملے آپ کے یہاں ملتے تھے، اور جس قدر ادیبانہ آہنگ بیان کی خوبصورتی ،لفظوں کے حسن، تعبیرات کے جمال اور جملوں میں رعنائی وزیبائی سے آپ کا کلام آراستہ ہوتا تھا میرے خیال میں ہمعصروں میں شاید ہی کسی کے یہاں یہ چیز رہی ہو، وہ بہت نپے تلے جملے استعمال کرتے تھے، اردو زبان کے ادبی محاوروں سے ان کی گفتگو عموماً مزین ہوتی تھی، برمحل اشعار سے سجی ہوتی تھی، تدریس کے دوران ظرافت کی بھی شوخ کرنوں سے حاضرین کو محظوظ کرتے رہتے تھے، ان کی گفتگو کا ایک مخصوص لہجہ تھا، ایک منفرد ادا تھی، نادر آہنگ تھا، جو انہیں کے ساتھ خاص تھا، یہی خاص طرز ادا ان کے کلام میں جاذبیت پیدا کرتی تھی، مقناطیسیت اور دلکشی پیدا کرتی تھی مخاطب استفادہ کے ساتھ ساتھ ادبی زبان و بیان طرز ادا کی سحر انگیزی اور لہجے کی دل آویزی سے مسحور بھی ہوتا رہتا تھا۔

مرحوم ایک عمدہ اور اچھے مقرر بھی تھے، علمی وادبی مجلسیں ہوں یا عوامی اجلاس ان کے خطابات بہت ذوق وشوق سے سنے جاتے تھے، وہ بہت سنجیدہ انداز میں موضوعات کے مطابق اور سامعین کے معیار کے لحاظ سے اپنی بات کہتے تھے، اور معتدل آواز وآہنگ میں روانی کے ساتھ اس طرح خطاب کرتے کہ مطالب ومفاہیم عیاں ہوتے چلے جاتے، جانے کتنے لوگوں نے ان کی تقریروں سے فیض حاصل کر کے اپنی زندگی کی سمتیں بدلی ہیں، اپنے زاویئے بدلے ہیں، اور جانے کتنے تشنگان علوم وادب نے ان کے حقائق ومعارف کی روشنی سے اپنے قلب سے منور کیا ہے، اس کا شمار وانداز ہ کیونکر ممکن ہے۔

مولانا عبدالخالق صاحب، کی شخصیت اخلاق ومحبت کا پیکر تھی، وہ نہایت شفیق، مہربان، نرم دل، نرم خو، اور خلیق وملنسار تھے، ان کی زندگی سادگی وشرافت، تواضع وانکساری، اور ہمدردی وغم گساری کا مجسمہ تھی، ضرورت مند ان کے یہاں حاضر ہوکر اپنی حاجت کا ذکر کرے، تو اس کی مدد کے لئے فکر مند ہوجاتے اور جو کچھ بس میں ہوتا، ضرور کرتے، وہ شاگردوں سے بہت محبت کرتے تھے، غلطیوں پر بھی وہ غصہ نہیں ہوتے بلکہ محبت کے لہجے میں تنبیہ کرتے، ان کا قلب انتقامی جذبات، بغض وعناد، اور دوسری پست صفتوں سے یکسر پاک تھا، دارالعلوم دیوبند جیسے مرکزی ادارہ میں رہنے کے باوجود کسی قسم کے کروفر، اور تزک واحتشام سے ان کی زندگی بالکل ناآشنا تھی، شہرت وناموری سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا، کہ تدریسی فرائض، اہتمام کی ذمہ داریوں اور طلباء کی اصلاح وتربیت کے علاوہ دیگر بکھیڑوں سے انہیں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ایسے ہی لوگوں کی زندگیاں دلوں میں دیر تک زندہ رہتی ہیں، ان کے اخلاق وکردار کے درخشاں نقوش لوح قلب پر اس طرح مرتسم ہوتے ہیں کہ وقت کی گردشیں بھی انہیں محو کرنے سے عاجز ہوجاتی ہیں، ان کی یادوں کے چراغ ہمیشہ ذہن کے طاقچوں میں فروزاں رہتے ہیں۔

حضرت مولانا ۱۹۵۰ء مطابق ۱۳۷۰ھ میں ضلع سنبھل مرادآباد کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم نصیر احمد صاحب بہت متقی اور پرہیزگار تھے، تقوی اور روحانیت کے اس ماحول نے آپ کی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا، جس

کی وجہ سے شروع ہی سے طبیعت سنجیدہ اور نیکیوں کی طرف مائل تھی۔

مکتب کی ابتدائی تعلیم مولانا مرحوم نے مدرسہ وحید المدارس محلہ سرائے ترین میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ شمس العلوم میں حفظ قرآن کی تکمیل کی اور اسی ادارے میں عربی چہارم تک کا مرحلہ بھی طے کیا، شرح جامی پڑھنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۸۸ھ-۱۹۶۹ء میں داخلہ لیا اور وقت کے جلیل القدر اعاظم رجال سے حدیث کی امہات الکتب پڑھ کر ۱۳۹۲ھ- ۱۹۷۲ء میں سند فراغت حاصل کی، دارالعلوم دیوبند میں آپ نے مختلف اصحاب علم وفضل سے استفادہ کیا، جن میں نادرہ روزگار شخصیت مولانا وحیدالزماں کیرانوی، مولانا محمد سالم صاحب اور مولانا نصیر احمد صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ دورہ حدیث میں حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی سے بخاری شریف پڑھی مگر ان کے انتقال کے باعث کچھ ہی حدیث ان سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی اس کے بعد حکیم الاسلام قاری محمد طیب سے بقیہ حصے کی تکمیل کی بخاری شریف جلد ثانی فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی سے پڑھی، ابن ماجہ میں مولانا انظر شاہ کشمیری رح بھی آپ کے استاذ تھے۔

تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد ۱۹۷۳ء میں مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ میں میں تدریس سے وابستہ ہوئے یہاں چھ سال تک آپ کا فیضان جاری رہا، اس کے بعد جامع الہدی میں تین سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، بعدازاں ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور پھر یہیں پوری زندگی تعلیم وتدریس میں گذاردی۔

ادھر تقریباً چار پانچ ماہ سے مولانا مرحوم مختلف عوارضات کا شکار ہوئے، علاج ومعالجہ کا اہتمام بھی رہا، اور لوگوں کو محسوس ہوا کہ زندگی صحت کی طرف لوٹ آئی ہے مگر صحت کا یہ دورانیہ چراغ سحر کی بھڑکتی لو کے مانند تھا، دوبارہ بیمار ہوئے مگر جان بر نہ ہوسکے، اور ۳۰/ جولائی ۲۰۲۱ء بروز جمعہ کو یہ پیکر علم وعمل دار آخرت کی طرف روانہ ہوگیا۔

پھٹے خیموں سے ٹوٹی کشتیوں سے رہ گذاروں سے
دیئے ہیں زندگی کو آفتاب زندگی ہم نے

میرے استاذ حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ کی چند یادیں

مفتی تنظیم عالم قاسمی

۱۹۹۵ء کا سال تھا جب میں عربی ششم (ثانیہ) میں شریک درس تھا۔ شعری ادب کی مشہور کتاب ''دیوان متنبی'' حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ سے وابستہ تھی، ان کے گھنٹے سے مجھے اس لئے بھی مسرت تھی کہ ایک ادیب وقت سے مجھے پڑھنے کا موقع مل رہا تھا، جن کی صلاحیتوں کے طلبہ و اساتذہ سب معترف تھے اور فن ادب میں بالخصوص وہ لاثانی سمجھے جاتے تھے؛ لیکن ان کی سختی اور وقت کی پابندی بہت مشہور تھی۔ ڈرتے سہتے پہلی تپائی پر جگہ لی جس کے نتیجے میں پورے سال درسگاہ کی پابندی اور عبارت خوانی مقدر بن گئی، ان کے پاس عبارت پڑھنے کے لئے پہلے سے مکمل مغزماری کرنی پڑتی اور مکمل تیاری اور بیدار مغزی کے ساتھ حاضر ہونا پڑتا اس لئے بھی ہمارے بہت سے رفقاءدرس ان کے پاس عبارت پڑھنے سے ہچکچاتے تھے۔

گرمی ہو یا سردی بہترین جوتا اور موزہ، شاندار شیروانی پھر اس کے مناسب نستعلیقی ٹوپی اور چلنے کے خاص انداز سے ان کی شخصیت مزید نکھرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ نازک مزاج تھے، طبیعت کے خلاف کسی کام سے چہرے کا رنگ بدل جایا کرتا تھا، یہ گھنٹہ میقات ثانی میں بعد نماز ظہر متصلاً تھا اس کے باوجود ان کے گھنٹے میں حاضر ہوجاتے تھے۔ جب کھٹ کھٹ کی آواز کانوں سے ٹکراتی تو ہم سمجھ جاتے تھے حضرت تشریف لا رہے ہیں اور یہ ان کے جوتے کی آواز ہوتی تھی، شاہی زرق برق اور علمی رعب سے درسگاہ میں سناٹا چھا جاتا تھا اور پھر عبارت خوانی کے بعد لغات کی تحقیق، وجہ اعراب، سلیس ترجمہ اور عبارت کی انوکھی تشریح سے جو لذت ملتی تھی اس سے آج بھی کان میں رس گھلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

عام طور پر حضرات اساتذۂ کرام کسی وجہ سے درسگاہ تشریف نہیں لاتے ہیں تو اس کی اطلاع پہلے سے طلبہ کو نہیں دی جاتی ہے، اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اب اور تب میں پورا گھنٹہ یوں ہی گذر جاتا ہے اور پورا وقت ضائع ہوجاتا ہے، کسی کو کہیں اگر شدید ضرورت سے جانا ہوتو نہیں جاسکتا ہے؛ لیکن اس سلسلے میں حضرت مولانا انداز نرالا تھا، وہ کسی وجہ سے اگر نہیں آسکتے تھے تو پیشگی اس کی اطلاع بھیج دیتے؛ تاکہ طلبہ ذہناً آزاد ہوجائیں اور وہ اپنے طور پر کام میں مصروف رہ سکیں...... مولانا کا امتیاز یہ تھا کہ وہ خود درسگاہ کے پابند بناتے تھے۔ کسی طالب علم کی بلاوجہ غیر حاضری سے سخت ناراض ہوتے اور دوسرے دن باز پرس کرتے۔ یاد ہے کہ میرے سال میں جمعیۃ علمائے ہند کے تحت دہلی میں ایک بڑا جلسہ تھا جس میں دارالعلوم کے بہت سے طلبہ شریک ہوئے تھے، میرے بہت سے رفقاء بھی اس میں شریک ہوئے جس کی وجہ سے وہ ایک دن کے لئے درسگاہ میں غیر حاضر ہوگئے، طلبہ کے لئے باضابطہ اس کے لئے کوئی اعلان کیا گیا تھا اور نہ ان کے لئے رخصت منظور کی گئی تھی، دوسرے دن طلبہ جب حاضر ہوئے تو جلسے کے دن غیر حاضر تمام طلبہ پر مولانا برس پڑے اور انہیں درسگاہ میں یہ کہہ کر بٹھانے سے انکار کردیا کہ یا تو جلسے میں شرکت کا دعوت نامہ دکھاؤ یا دفتر تعلیمات سے رخصت کی منظوری یا پھر باضابطہ معافی نامہ لکھ کر دفتر تعلیمات میں جمع کرواور وہاں سے درسگاہ میں بٹھانے کا اجازت نامہ لے کر آؤ۔ یہ کام طلبہ کے لئے آسان نہیں تھا؛ لیکن کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا، کئی دن لگ گئے اس راہ سے گذر کر ہی طلبہ درسگاہ میں دوبارہ شریک ہوئے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ نے پھر کبھی غیر حاضری کی جرأت نہیں کی۔

حضرت مولانا ہمیشہ طلبہ کو محنت پر ابھارتے اور دنیا میں ممتاز ہوکر جینے کا سبق دیتے تھے، فرماتے کہ پختہ صلاحیت کے بغیر تم کسی کام کے نہیں رہوگے، زندگی صرف گذارنا تمہارا مقصد نہیں ہونا چاہئے وہ کوئی بھی گذار لیتا ہے، تم اپنے اندر ایسا کمال پیدا کرو کہ تم مطلوب بن جاؤ اور لوگوں کی ضرورت بن جاؤ، تم جگہ کو نہیں؛ بلکہ جگہ تم کو خود ڈھونڈے۔ تمہارا ذہن جس فن میں چلتا ہے اسی کو اختیار کرو اور اگر پڑھنے میں ذہن نہیں چلتا ہے تو مجبوراً مت پڑھو بہتر ہے کہ

کوئی ہنر سیکھو، درزی بنو، کاتب بنو، میکانک بنو، کچھ بھی بنو؛ مگر اپنے علم وفن کا امام بن جاؤ اور اپنے میدان کا لاثانی بنو۔زیادہ تر مشہور کاتب خلیل ٹونکی کی مثال دیتے اور فرماتے کہ انھوں نے کتابت میں ایسا کمال پیدا کیا کہ لکھنے کا ان کے پاس ٹائم نہیں رہتا تو لوگ صرف سرورق پر کتاب کا نام لکھانے کے لئے آتے اور صرف ایک لائن لکھنے کا وہ ہزاروں روپیے لیتے تھے۔ کبھی کبھار مزاحاً فرماتے کہ مدرسے کے طلبہ بھی کتنے بے حس ہوتے ہیں کہ فیل ہونے پر بھی ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اسکولس اور کالجسس کے طلبہ کو دیکھو فیل ہونے پر اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی خودکشی کر لیتے ہیں؛ لیکن مدرسے کے طلبہ کبھی یہ اقدام نہیں کرتے۔

مولانا اپنی ذات میں انجمن تھے، مختلف الجہات صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے ان میں ودیعت کی تھیں۔ اردو عربی دونوں زبان و ادب پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی اور دونوں زبان میں ان کی تحریریں بہت قیمتی، البیلی اور مثالی ہیں۔ مجھے ان کی دو کتاب پر تبصرہ لکھنے کی سعادت حاصل ہے جو حیدرآباد سے نکلنے والا کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' میں ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک کتاب ''کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے'' اور دوسری کتاب ''عالم اسلام کے خلاف موجودہ صلیبی صہیونی جنگ'' ہے۔

اپنے استاذ کی کتاب پر تبصرہ لکھ کر اس وقت بڑی مسرت ہوئی تھی بالخصوص اس لئے بھی کہ مولانا نے اسے کافی پسند کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے۔ آمین

❀❀❀❀❀

دامن چرخ سے اک اور ستارہ ٹوٹا

شرف الدین عظیم الاعظمی

زندگی کا وجود موت کی تمہید ہے، انسان کا اس دنیا میں آنا ہی اس کے جانے کا الارم ہے، وہ اس امتحان گاہ میں محدود وقت کے لئے آتا ہے اور پھر حیات مستعار گذار کر ابدی سفر پر روانہ ہوجاتا ہے، اس روئے زمین پر وجود وعدم کا سفر اسی نظام کے تحت جاری ہے، لیکن ادھر تقریباً دو سال سے زندگی کے گلشنوں پر موت کی ایسی ہلاکت خیز بارش ہوئی ہے اور گلزار ہستی پر موت کے مہیب سائے کچھ اس طرح دراز ہوئے ہیں جیسے موسم بہار میں یکا یک خزاں کی بے رحم بادصرصر کے نتیجے میں سرسبز وشاداب شاخوں کے رشتے پھولوں اور پتیوں سے ٹوٹ جائیں۔

عالم آخرت کی طرف علم وعمل کا کارواں اور عشق ووفا کا قافلہ ہمیشہ سے محوسفر ہے مگر عصر رواں میں یہ اس قدر تیز گام ہوا ہے، اور اس قدر برق رفتار ہوا ہے کہ اس کی فرقت اور جدائی کے زیر اثر احساسات کے زخموں کی صورت گری میں خامہ خونچکاں کی ہمتیں پست ہوکر رہ گئی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے داغ مفارقت دے جانے والی ان عہد ساز شخصیتوں کی مرثیہ نویسی میں قلم بالکل تھک چکا ہے اور اس کی روشنائی خشک ہوچکی ہے۔ آسمان فضل وکمال کا ایک ستارہ ٹوٹ کر گرتا ہے، ہر سو تاریکیاں پھیلتی ہیں، وقت کا مرہم ابھی احساسات کے زخموں کی سرخی تبدیل نہیں کرنے پاتا کہ علم وعمل کا دوسرا ستارہ ہمیشہ کے لیے عدم کے پردے میں چلا جاتا ہے۔

ادبی دنیا کی عالمی شخصیت حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کے سفر آخرت کو ابھی کتنے دن ہوئے ہیں، قاری عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی وفات کا سانحہ تو ابھی بالکل تازہ ہے، فن حدیث کے بے تاج بادشاہ مولانا حبیب الرحمن اعظمی صاحب کی وفات

کے صدمے کی بدلیاں تو ہنوز پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ذہن کی فضا پر چھائی ہوئی ہیں، رنج والم کے گھٹن زدہ ماحول سے ابھی زندگی نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ دیار مشرق کے ممتاز عالم دین، علوم اسلامی کی تقریباً تمام انواع پر حیرت انگیز عبور رکھنے والی شخصیت مولانا عبدالستار صاحب اعظمی نوراللہ مرقدہ بھی اس دارفانی سے ہمیشہ کے کوچ فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالستار صاحب معروفی نوراللہ مرقدہ کی ذات سے بچپن ہی سے سماعت آشنا تھی، ابتدائی عربی تعلیم عربی دوم کے لئے جامعہ حسینیہ جون پور میں راقم داخل ہوا تو حضرت مولانا مرحوم کی علمی عظمت، فنی بلندی اور تدریسی صلاحیتوں کے آوازے سے مدرسے کی پوری فضا گونج رہی تھی، اسی درسگاہ میں آنے کے بعد پہلی بار زیارت ہوئی، طویل القامت اور متوازن جسم، صاف روشن اور نہایت گورا چہرہ، کشادہ پیشانی، سیاہ آنکھیں جس میں فراست ایمانی کا نور، سفید اور گھنی ڈاڑھی، سر پر دوپلی ٹوپی، سفید کلی دار کرتا اور پاجامہ، کندھے پر مرتب انداز میں سلیقے سے سمیٹا ہوا سفید رومال، گفتگو میں عالمانہ وفاضلانہ سنجیدگی اور رفتار و چال میں وقار ومتانت، کپڑے بالکل سادہ مگر بالکل صاف وشفاف، ہئیت وسراپا مکمل نستعلیقیت کا نمونہ، چہرے پر جمالیاتی کرنیں، جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والوں کو متوجہ کرتیں اور قلب وذہن پر خوشگوار اثرات کا نقش چھوڑ جاتیں۔

ناچیز جس درسگاہ میں تھا اس میں حضرت مولانا مرحوم کا کوئی گھنٹہ نہیں تھا اس لیے اکتساب فیض سے محرومی رہی، تاہم کبھی کبھی ان کی مجلس میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، اور ان کے بلند افعال وکردار، اوران کے صلاح وتقوی اور ان کی سادگی وبے نفسی جیسے عظیم اوصاف کو قریب سے دیکھا، جو لوح دل پر ہمیشہ کے لیے نقش کالحجر ہوگئے، حسینیہ چھوڑنے کے بعد بھی چونکہ وہ شیخو پورا اعظم گڈھ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمت اللہ علیہ کے یہاں آیا کرتے تھے اس لیے کبھی کبھی ملاقات کا شرف حاصل ہوجاتا تھا۔

حضرت مولانا عبدالستار صاحب کو قدرت نے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا، وہ فن تفسیر وحدیث پر گہری نگاہ رکھتے تھے، عربی ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم پر بھی انہیں زبردست

دسترس حاصل تھی، منطق وفلسفہ میں تو انہیں امتیازی شان حاصل تھی اوراس حوالے سے مدرسے میں ان کی شہرت بھی زیادہ تھی۔

عربی زبان وادب پر مولانا مرحوم کی گرفت اوران پر عبوراس قدر تھا کہ ادارہ میں تو کیا خطے اور علاقے میں بھی کم ہی ان کا کوئی ہم پلہ نظر آتا تھا، ان کی عربی نثر جس قدر مضبوط تھی نظم کی صنف پر بھی اسی طرح قدرت تھی۔

انھوں نے متعدد مواقع پر عربی زبان میں نظمیں لکھیں ترانے لکھے اور اور قطعات لکھے۔ اسی طرح اردو زبان وادب کے اسرار ورموز سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھے، جامعہ حسینیہ کے پروگراموں میں طلباء کے لئے مکالمے تقریریں اور دوسری قسم کی ثقافتی تحریریں انہیں کے قلم سے وجود میں آتی تھیں، وہ قادرالکلام اورعمدہ شاعر تھے، انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں قطعات بھی لکھے ہیں، مگرزیادہ تر انھوں نے نعتیہ کلام پر توجہ دی ہے، میرے خیال میں ان کے نتیجہ فکر میں پچاسوں کی تعداد میں نعتیں اور نظمیں ظہور میں آئی ہیں۔

مذکورہ خصوصیات وکمالات میں جس وصف نے انہیں امتیازی مقام عطا کیا ہے وہ ان کی تعلیم وتدریس کی صفت ہے صحیح یہ ہے کہ وہ پڑھنے پڑھانے کے آدمی تھے، تدریس میں زبردست ملکہ انہیں حاصل تھا، علوم ومعارف کے استحضار کے ساتھ ساتھ افہام وتفہیم اورانتقال وترسیل کی صلاحیت نے ان کے درس کو بے پناہ مقبولیت عطا کی تھی، وہ جس موضوع پر درس دیتے اسے ذہنوں میں اتاردیتے، جس فن کی کتاب پڑھاتے اس کے حقائق واسرار کوسورج کی روشنی کی طرح واضح کردیتے، ان کے ٹھوس علم، استحضار علم، فن پر قدرت، اورترسیل وتفہیم کی حیرت انگیز صلاحیتوں نے اس ادارے میں بھی اوراس سے پہلے وہ جہاں بھی اس حوالے سے قیام پذیر تھے وہاں بھی۔ تعلیمی استحکام اور مضبوطی میں نمایاں کردارادا کیا ہے، جامعہ حسینیہ کی تعلیمی عمارت میں یقینی طور پر آپ کی تدریسی خدمات اور تعلیمی اوصاف وکمالات مرکزی ستون کی حیثیت رکھتے تھے آپ کی رحلت کی وجہ سے یہ ستون اب ٹوٹ چکا ہے جس کا بدل بظاہر نظر نہیں آرہا ہے۔

مولانا مرحوم کو تحریر وقلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اسی وجہ سے کسی علمی موضوع پر ان کا کوئی تحریری سرمایہ موجود نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس حوالے سے بہت باذوق تھے، زبان وادب کی باریکیوں پر ان کی نہایت محققانہ نظر تھی، اور اظہار بیان کی قوت بھی زبردست تھی، اس کا راز حج بیت اللہ کے زمانے میں کھلا جب جذبات کی مصوری میں ان کے قلم نے سینہ قرطاس پر اپنے جوہر دکھائے، اور نسیم حجاز کی صورت میں ایک ادبی سرمایہ اہل شوق کی خدمت میں پیش کیا، استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نوراللہ مرقدہ اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں: ''پچھلے سال میرے بزرگ دوست حضرت مولانا عبد الستار صاحب معروفی جو جامعہ حسینیہ جونپور میں صدر المدرسین ہیں اور سابق ضلع اعظم گڑھ اور موجودہ ضلع مئو کی مشہور مردم خیز آبادی پورہ معروف کے رہنے والے ہیں بہترین عالم، عمدہ ترین مدرس، کامیاب منتظم، حج کو تشریف لے گئے، مولانا مدرس تو ہیں، لیکن خطیب ومقرر نہیں ہیں، حج کو تشریف لے گئے صاحب دل ہونا تو معلوم تھا صاحب قلم ہونا معلوم نہ تھا، مجھے کوئی تصور نہیں تھا کہ مولانا کا سفر حج کاغذ پر بھی منتقل ہوگا، ابھی کچھ دنوں پہلے اچانک مجھے اطلاع ملی اور اطلاع کے معابعد ہی کتابت شدہ پروف ملے کہ مولانا نے اپنے سفر کی روداد لکھی ہے، اور اس کا اسلوب وانداز دوسرے سفر ناموں سے الگ ہے، پھر میں اسے پڑھنے لگا، پڑھتا گیا، اور دل میں سفر حج کی حلاوت ولذت تو محسوس کرتا ہی رہا، ساتھ ساتھ بہترین اہل قلم اور ادیب ہونے پر حیرت ہوتی رہی''۔ (نسیم حجاز: ص:۷)

مصنف کے طرز ادا کی دلکشی، اور ان کے دل آویز اسلوب اور تجربات ومشاہدات کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالنے کی صلاحیت کے متعلق مزید مولانا اعظمی فرماتے ہیں:

''یہ خطوط سادگی و پرکاری کے بہترین نمونے ہیں، ادیبانہ طرز کے خطوط، موقع ومحل سے عمدہ اشعار کا برجستہ استعمال، بڑا دل آویز مرقع ہے، ان خطوط سے ظاہر ہوا کہ مولانا فطری ادیب ہیں''۔ (ایضا)

مولانا مرحوم کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ طلباء پر بہت شفیق تھے، ان سے بہت

محبت کرتے تھے، وہ سختی اور تشدد کے قائل بھی نہیں تھے اور نہ ہی ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرتے تھے، وہ تربیت اور ذہن سازی پر پوری توجہ مرکوز رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ طلباء ان سے قریب رہتے تھے، درسگاہوں میں بھی وہ تنبیہ کے وقت طنز وتعریض سے زیادہ کام لیتے تھے اس شفقت ومحبت کا اثر تھا کہ طلباء انہیں دادا محترم سے خطاب کرتے تھے، جس ادارے میں انھوں نے زندگی کے بیشتر لمحات گذارے تھے وہاں ہر معاملے میں قوانین وضوابط کی ہرسو اجارہ داری تھی ایسے ماحول میں مولانا مرحوم کی تربیت ورجال سازی، اورنرمی ومحبت اندھیری راتوں میں کسی روشن قندیل سے کم نہیں تھی۔

ماضی قریب کی عظیم علمی وادبی شخصیت حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمت اللہ علیہ سے انہیں بے حد محبت تھی، اوران سے تعلق بہت گہرا تھا، یہ محبت اور تعلق انہیں اکثر شیخوپور کھینچ لاتی تھی، حضرت مولانا اعظمی بھی ان سے بہت مخلصانہ تعلق اور محبت رکھتے تھے، یہ تعلق دونوں حضرات کی آخری عمر تک استوار رہا۔ عملی اعتبار سے مولانا کی زندگی سلف صالحین کا نمونہ تھی، تعلیم ومطالعہ کے علاوہ ان کا سارا وقت عبادت وریاضت اور ذکر وفکر میں گذرتا تھا، وہ باضابطہ سلوک ومعرفت میں کس سلسلہ میں داخل تھے یہ تو معلوم نہ ہوسکا مگر ان کی زندگی میں عبادت وریاضت، نمازوں کی پابندی، تکبیر اولی سے جماعت کا اہتمام، تہجد کی پابندی، اور قران کی تلاوت میں حد درجہ اشتغال ومصروفیت کے حوالے سے یہ کہنا بجا ہے کہ وہ طریقت کی راہ کے کامیاب مسافر تھے۔

انہیں وجوہات اور مثالی خصوصیات وکمالات کی بنا پر مدرسے کے ناظم مولانا توفیق احمد صاحب انہیں بہت زیادہ مانتے تھے اور ہر موقع پر ان کا خیال رکھتے تھے، چندسال قبل مولانا بیمار ہوئے اور آپریشن کی نوبت آئی تو مولانا توفیق صاحب خود انہیں لے کر ممبئی آئے اور اپنی نگرانی میں ان کا علاج کرایا، کسی ادارے کے ذمے دار کے لئے اس میں بہت بڑا سبق اور قابل تقلید نصیحت ہے۔

حضرت مولانا عبدالستار صاحب معروفی رحمت اللہ علیہ کے سوانحی احوال وکوائف کے

بارے میں ہمارے رفیق محترم مفتی عبیداللہ شمیم صاحب اعظمی نے اپنے مضمون میں بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اس حوالے سے معلومات کے لئے انہیں کی تحریر کا اقتباس میرے خیال میں کافی ہے: ''حضرت مولانا عبدالستار صاحب اہل علم کی معروف بستی پورہ معروف ضلع مئو سے تعلق رکھتے تھے، جہاں آپ کی ایک ایسے علمی خاندان میں پیدائش ہوئی جو نیک نامی اور اپنی شہرت کی بنا پر ہر خاص وعام میں مقبول ومعروف تھا، آپ کی ولادت یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو پورہ معروف کے محلہ بانسہ ضلع مئو میں ہوئی، آپ حضرت مولانا قاری ظہیر الدین صاحب معروفی رحمہ اللہ (ولادت: ۱۴ محرم ۱۳۳۱ھ، وفات: ۱۴۰۴ھ) کے صاحب زادے تھے۔ آپ کے دادا کا نام حافظ رحیم بخش (متوفی: ۱۳۳۳ھ) تھا، ان کے لڑکے یعنی قاری ظہیر الدین صاحب کی ایسی تربیت ہوئی تھی کہ وہ پوری زندگی قرآن پاک کی خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے اس زمانے کے مشہور اساتذہ سے اکتساب فیض کیا، جن میں حضرت مولانا محمد شبلی شیدا خیرآبادی، مولانا عبدالحئی صاحب مئوی، حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب بحری آبادی جن سے خاص طور پر قرات کی تعلیم حاصل کی اور اس فن کی کتابیں پڑھیں، اسی طرح فخر القراء قاری محب الدین صاحب الہ آبادی سے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں فن قرات کی مشہور کتاب شاطبیہ، التیسیر، معرفۃ الوقوف وغیرہ پڑھ کر قرات سبعہ، عشرہ سے فراغت پائی تھی اور علم حدیث حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمہ اللہ کی خدمت میں رہ کر حاصل کیا، اور بعد میں مدرسہ روضۃ العلوم پھولپور میں تدریسی خدمات بھی انجام دی تھی۔ حضرت قاری ظہیر الدین صاحب کی کتاب ''احیاء المعانی'' فن قرات میں بہت مشہور ہے، اس فن کا کوئی بھی طالب علم اس کتاب سے مستغنی نہیں ہوسکتا، اس کتاب کو انہوں نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے زمانہ تدریس میں تالیف فرمائی تھی''۔

ایسے علمی ماحول میں آپ کی نشونما ہوئی، صلاح وتقوی کے آثار بچپن سے ہویدا تھے، اور آپ نے درس کی تمام کتابوں کو بہت محنت سے پڑھا اور ہر فن میں کمال پیدا کیا، یہی وجہ تھی کہ آپ سے متعلق بھی کتاب ہوتی اور اس کا درس دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس فن میں

آپ یکتا ہیں۔

آپ نے عربی کی تعلیم پورہ معروف میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور ۱۳۷۹ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔آپ نے اس زمانے کے مشہور محدثین سے علم حدیث حاصل کیا،جن میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مرادآبادی سے بخاری شریف اور اس کے علاوہ علامہ ابراہیم بلیاوی،مولانا بشیر احمد صاحب اور دیگر اساتذہ سے استفادہ کیا۔

تدریسی خدمات:

فراغت کے بعد دس سال تک گھریلو کام میں مشغول رہے، ۱۳۸۹ھ میں مدرسہ دارالرشاد بارہ بنکی میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور تقریباً نو سال تک یہاں تدریس سے وابستہ رہے۔ وہاں آپ کے بہت سے تلامذہ ہوں گے،جن میں دارالعلوم دیوبند کے ہمارے استاذ حضرت مولانا نسیم احمد صاحب بارہ بنکوی مدظلہ بھی شامل ہیں۔

اس کے بعد ۱۳۹۸ھ سے ۱۴۱۱ھ تک مرکزی دارالعلوم محمدیہ گھوسی میں مدرس رہے۔ بعدازاں ۱۴۱۳ھ سے رجب ۱۴۴۲ھ تک جامعہ حسینہ لال دروازہ جونپور میں تعلیم وتربیت کے مبارک مشغلے میں نہایت جانفشانی،انہماک انضباط سے عظیم خدمات انجام دیں۔یہی آپ کی آخری منزل ثابت ہوئی۔پھر بوجہ علالت تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

۱۴۲۱ھ میں حج کی سعادت سے فیضیاب ہوئے اور "نسیمِ حجاز" کے نام سے اعمال حج، مقامات مقدسہ اور وہاں کے مشاہدات وتاثرات بہت ہی دلنشین،سلیس اور شستہ اسلوب میں تحریر فرمایا،اسی طرح آپ ایک بہترین شاعر تھے،اردو فارسی اشعار پر ملکہ حاصل تھا اور بہت سے نوآموز شعراء آپ سے تصحیح کراتے تھے،نیز طلبہ کی تقریری مشق کے لئے "دینی،علمی اور اصلاحی مکالمے" کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی،یہ دونوں کتابیں مطبوع ہوئیں اور اہل علم میں خوب مقبول بھی ہوئیں۔

ایک سال قبل آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا، آپ کے پسماندگان میں دولڑکیاں اور چار لڑکے ہیں۔(۱) مولانا محمد عمران صاحب استاد جامعہ اسلامیہ بنارس (۲) مولانا حافظ رضوان احمد صاحب استاذ مدرسہ معروفیہ (۳) مولوی محمد سلمان صاحب (۴) مولوی حافظ غفران صاحب۔

آخر الذکر دونوں گھر پر مقیم ہیں،،ایک عرصے سے مولانا مرحوم مختلف عوارض کا شکار تھے زندگی طبعی عمر کو پہونچ چکی تھی، تعلیم و تعلم کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، بال آخر ۲۵ر جولائی ۲۰۲۱ر بروز اتوار بعد عشاء نو بجے اللہ کے اس برگزیدہ بندے نے اس جہان فانی کو الوداع کہا اور زندگی بھر کی دینی جدو جہد کا صلہ لینے کے لئے رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا۔

تیرہ وتار تھی پہلے ہی یہاں شام حیات
دامن چرخ سے اک اور ستارہ ٹوٹا

❀❀❀❀❀

قسط اول:

تحذیر الناس: ایک مطالعہ

حفظ الرحمن قاسمی اعظمی

تحذیر الناس حضرت نانوتوی کی ایک شہرہ آفاق کتاب ہے، جس کا بنیادی موضوع تو قرآن کی ایک آیت اور حضرت ابن عباس کے ایک اثر کے مابین تعارض کا حل ہے، لیکن دوران بحث کچھ ایسے مسئلے بھی زیر قلم آ گئے ہیں جو صرف حضرت نانوتوی کا ہی حصہ ہے، یہ کتاب اپنے مشمولات کے اعتبار سے جس قدر دلچسپ ہے اپنے انداز بیان اور موضوع کی ندرت کے لحاظ سے اتنی ہی پیچیدہ، پیش نظر تحریر میں مذکورہ بالا کتاب کے مشمولات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سبب تالیف:

آپ کے شاگرد رشید مولانا احسن نانوتوی رح نے ایک استفتاء بھیجا، جو قران کی آیت: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اور اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ کی تفسیر کے تحت مذکور حضرت ابن عباس کے اثر: "اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ سَبْعَ أَرْضِيْنَ، فِي كُلِّ أَرْضٍ آدَمُ كَآدَمِكُمْ، وَنُوْحٌ كَنُوْحِكُمْ، وَاِبْرَاهِيْمُ كَاِبْرَاهِيْمِكُمْ، وَعِيْسَى كَعِيْسَاكُمْ، وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ۔ کے مابین تعارض پر مبنی تھا، آپ استفتاء میں تحریر فرماتے ہیں:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس باب میں کہ:

زید نے بہ تتبع ایک عالم کے، جس کی تصدیق ایک مفتیٔ مسلمین نے بھی کی تھی، دربارۂ قول ابن عباس رض جو درمنثور وغیرہ میں ہے:

”اِنَّ اللّٰـهَ خَلَقَ سَبْعَ أَرْضِيْنَ، فِي كُلِّ أَرْضٍ آدَمُ كَآدَمِكُمْ، وَنُوْحٌ كَنُوْحِكُمْ، وَإِبْرَاهِيْمُ كَإِبْرَاهِيْمِكُمْ، وَعِيْسَى كَعِيْسَاكُمْ، وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ۔ کے یہ عبارت تحریر کی کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ: حدیثِ مذکور صحیح اور معتبر ہے، اور زمین کے طبقات جدا جدا ہیں، اور ہر طبقہ میں مخلوقِ الٰہی ہے۔ اور حدیثِ مذکور سے ہر طبقہ میں انبیاء علیہم السلام کا ہونا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اگر چہ ایک ایک خاتم کا ہونا طبقاتِ باقیہ میں ثابت ہوتا ہے؛ مگر اس کا مثل ہونا ہمارے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت نہیں، اور نہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ: وہ خاتم مماثل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں؛ اس لیے کہ اولادِ آدم جس کا ذکر ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ“ میں ہے، اور سب مخلوقات سے افضل ہے، وہ اسی طبقہ کے آدم کی اولاد ہے بالاجماع۔ اور ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب اولادِ آدم سے افضل ہیں، تو بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات سے افضل ہوے۔ پس دوسرے طبقات کے خاتم جو مخلوقات میں داخل ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مماثل کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ انتہی۔

اور باوجود اس تحریر کے زید یہ کہتا ہے کہ: شرع سے اگر اس کے خلاف ثابت ہوگا، تو میں اسی کو مان لوں گا، میرا اصرار اس تحریر پر نہیں۔ پس علمائے شرع سے استفسار یہ ہے کہ: الفاظِ حدیث ان معنوں کو محتمل ہیں، یا نہیں، اور زید بوجہ اس تحریر کے کافر، یا فاسق، یا خارج اہلِ سنت وجماعت سے ہوگا، یا نہیں؟ بَيِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔

استفتاء کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس اثر کے ظاہر کو تسلیم کرتے ہوئے ہر طبقے میں ایک ایک محمد ﷺ کو مان لے، البتہ وہ یہ بھی تسلیم کرے کہ دیگر طبقات میں جو محمد ہیں ان کی شان ہمارے نبی محمد ﷺ کی طرح بالکل نہیں، تو کیا اس کا یہ عقیدہ قرآن کی آیت: **ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین** کے مخالف ہوگا؟۔

حضرت نانوتوی نے ”تحذیر الناس من انکار اثر ابن عباس“ میں اسی سوال کا جواب دیا ہے، جیسا کہ رسالے کے نام سے ظاہر ہے آپ نے اثر مذکور کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے آیت اور اس اثر کے درمیان تطبیق کا راستہ اختیار کیا ہے، آپ نے اثر مذکور کے ظاہر کو علی حالہ برقرار رکھتے ہوئے آیت قرانی: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے مفہوم ومعانی اور آیت قرانی: ٱللَّهُ ٱلَّذِى خَلَقَ سَبْعَ سَمَٰوَٰتٍ وَمِنَ ٱلْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ کی تفسیر وتشریح اس انداز میں بیان

کی کہ وہ اثر جو ابھی خاتم النبیین کے مخالف ومعارض تھا وہ اس آیت کا مؤید بن گیا۔ اس کتاب میں بنیادی طور پر چار باب ہیں۔

پہلا باب: خاتم النبیین کے معنی کی تعیین وغیرہ

دوسرا باب: آیت قرآنی: اَللّٰہُ الَّذِی خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ۔ کہ دلنشیں تشریح۔

تیسرا باب: اثر ابن عباس کی استنادی حیثیت اور اس اثر کی تشریح وتوضیح

چوتھا باب: تفسیر بالرائے اور اس کی اقسام کا حکم

پہلا باب:

سب سے پہلے لفظ خاتم سے بحث کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں:

''عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ ﷺ کا زمانہ انبیائے سابق کے زمانہ کے بعد، اور آپ ﷺ سب میں آخری نبی ہیں؛ مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تأخرِ زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں، پھر مقامِ مدح میں ''وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ'' فرمانا اس صورت میں کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟''

یعنی عوام نے جو یہ سمجھ لیا ہے کہ لفظ خاتم کا صرف ایک معنی ہے'' آپ کا آخر میں تشریف لانا'' اس لفظ کا یہ معنی تو ہے لیکن لفظ کو اسی معنی میں منحصر سمجھنا درست نہیں کیونکہ یہ آیت آپ کی فضیلت اور تعریف کے لئے نازل کی گئی ہے جبکہ'' آخر میں تشریف لانا'' کوئی ذاتی فضیلت کی چیز نہیں اس لیے آیت کا کوئی ایسا معنی بیان کیا جائے کہ آخری نبی والے معنی کے ساتھ ساتھ فضیلت والا معنی بھی ظاہر ہوسکے۔ پھر فضیلت والے معنی کی تلاش میں آپ نے ''موصوف بالذات'' اور'' موصوف بالعرض'' کا مسئلہ بیان کیا۔

حضرت نانوتوی کے نزدیک جب کوئی چیز کئی افراد کے درمیان مشترک ہو تو اس میں'' موصوف بالذات'' اور'' موصوف بالعرض'' کی تقسیم ہوگی، یعنی ایک فرد میں تو وہ شئی بطور وصف ذاتی ہوگی اور دیگر افراد میں عارضی؛ جیسے'' وجود'' کہ اللہ اور مخلوق کے درمیان مشترک ہیں لہذا

اللہ موجود بالذات ہوگا اور مخلوق موجود بالعرض؛ اور جیسے ''روشنی'' کہ سورج اور اور دیگر چیزوں کے درمیان مشترک ہے؛ لہٰذا ان میں ایک (سورج) منور بالذات ہوگا اور دیگر اشیاء منور بالعرض۔

نبوت بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام کے درمیان مشترک ہے لہٰذا نبوت کی بھی دو قسمیں ہوگی، نبوت بالذات، نبوت بالعرض؛ آپ ﷺ کی نبوت بالذات ہوگی یعنی آپ ﷺ کے سر پر تاج نبوت سجانے ہی کے لئے اللہ نے نبوت کی تخلیق فرمائی ہے، جب کہ دیگر انبیاء کو جو نبوت ملی ہے وہ آپ ﷺ کے فیضان اور واسطے سے ملی ہوئی نبوت ہے، یہی وجہ ہے کہ دیگر انبیاء تو اس وقت نبی کہلائے جب اللہ نے ان کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا، اور حضور اکرم ﷺ اس وقت بھی نبی تھے جب حضرت آدم علیہ السلام پانی اور مٹی کے درمیان تھے ارشاد نبوی ہے: **کنت نبیا و آدم بین الماء و الطین** آپ ﷺ کی نبوت ذاتی ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ امتیوں کے بھی نبی ہیں، اور تمام نبیوں کے بھی نبی ہیں۔

مولانا قاسم نانوتوی کے نزدیک کسی بھی شے کے موصوف بالذات بننے کے لئے دو شرطیں درکار ہوا کرتی ہیں۔

(۱) اس کی صفت خود اس کی اپنی ہو، غیر سے مستعار لی ہوئی نہ ہو؛ بلکہ غیر خود اس سے مستفید ہوں۔

(۲) مستفید ہونے والے تمام افراد کا سلسلہ اس پر جا کر ختم ہوتا ہو۔

چونکہ حضور کی نبوت بھی بالذات ہے اس لئے ان دونوں شرطوں کا وہاں بھی پایا جانا ناگزیر ہے، آگے مولانا قاسم نانوتوی نے اس بات کی دلیل ذکر کی ہے کہ کس طرح حضور ﷺ کی نبوت ذاتی ہے اور کس طرح تمام نبیوں کا سلسلہ آپ پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔

پہلی شرط: نبوت بالذات کے دلائل:

آپ ﷺ کی نبوت بالذات پر مولانا قاسم نانوتوی نے چار دلیلیں ذکر کی ہیں۔

پہلی دلیل:

”وَاِذْ أَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ لَمَا آتَیْتُکُمْ مِنْ کِتَابٍ وَّ حِکْمَۃٍ، ثُمَّ جَاءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عہد الست کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ اس عہد میں ہم, نے تمام انبیاء سے ایک وعدہ لیا تھا کہ اگر تمہیں نبی اکرم ﷺ کا زمانہ مل جائے تو تم سب ان کی تصدیق کرنا، ان کی مدد فرمانا اور ان پر ایمان بھی لانا۔

دوسری دلیل:

لو کان موسی حیا لما وسعہ الا اتباعی

اگر آج حضرت موسی علیہ السلام حیات ہوتے تو انہیں بھی میری ہی اقتداء کرنی پڑتی۔

تیسری دلیل:

ہر کہ ومہ کو معلوم ہے کہ آخری زمانے میں حضرت عیسی علیہ السلام تشریف لائیں گے اور آپ بھی حضور اکرم ﷺ کی شریعت پر عمل فرمائیں گے۔

ان تینوں دلیلوں میں ایک ہی بات ذکر کی گئی ہے کہ اگر کسی نبی کو حضور کا زمانہ مل جاتا تو اسے بھی حضور ہی کی اتباع کرنی پڑتی، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ ﷺ کی نبوت بالذات ہو اور ان کی نبوت بالعرض ہو، ورنہ ایک ہی نوع کی چیز میں اس قدر تفاوت چہ معنی؟

چوتھی دلیل:

حضور اکرم ا کا ارشاد ہے: "علمت علم الاولین و الآخرین" مجھ کو مجھ سے پہلے کے لوگوں کا بھی علم عطا کیا گیا ہے، اور مجھ سے بعد آنے والے لوگوں کا علم عطا کیا گیا ہے، یعنی میں تمام لوگوں کے علوم کا جامع ہوں یہ حدیث آپ کی نبوت بالذات پر اس طرح دلالت کرتی ہے کہ اس میں آپ ﷺ کو تمام بنی نوع آدم کے علوم کا جامع کہا گیا ہے، اور جو چیز جامع ہوا کرتی ہے وہ اصل ہوتی ہے، وصف ذاتی سے متصف ہوتی ہے۔

اس چوتھی دلیل پر اعتراض یہ ہوتا ہے کی اگر ”علمت علم الاولین و الآخرین“

میں آپ کی ذکر کردہ تاویلات وتوجیہات کو قبول کر لیا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ اعالم بالذات ہوئے اور دیگر لوگ عالم بالعرض؛ کیونکہ حدیث کے مطابق آپ اعلوم کے جامع ہیں اور اصول یہ ہے کہ جامعیت جہاں ہوگی اصلیت ومرکزیت بھی وہیں ہوگی لہذا یہ حدیث آپ اکے عالم بالذات ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ کہ نبی بالذات ہونے پر۔

حضرت نانوتوی نے اس کا جواب یہ دیا کی نبوت ''کمالات علمیہ''میں سے ہے لہذا اگر نبی کے علمی کمال کو بیان کیا جائے تو وہ صرف علمی کمال کا بیان نہ ہوگا بلکہ اس نبی کی نبوت کا بھی کمال ہوگا اسی طرح اگر نبی کی علمی جامعیت کو بیان کیا جائے تو وہ صرف علمی جامعیت نہ ہوگی بلکہ وہ نبوت کی بھی جامعیت واصلیت کا بیان ہوگا؛ پھر اس کے بعد مولانا نے پانچ دلیلوں سے یہ ثابت کیا کہ نبوت کمالات علمیہ میں سے ہے۔

(۱) امتی کا عمل میں بظاہر بڑھ جانا۔

(۲) نبوت کا اپنے ماخذ اشتقاق کے اعتبار سے۔

(۳) واذ اخذ اللہ میثاق النبیین کی آیت کے ذریعے۔

(۴) روح محمدی کی تربیت کے لحاظ سے۔

(۵) قرآن جیسے علمی معجزے کے لحاظ سے۔ (تفصیل کے لئے اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں)

بہر حال جب چار دلیلوں کے تمام مالہ وماعلیہ کے ذریعے مولانا قاسم نانوتوی نے موصوف بالذات کے لئے درکار پہلی شرط کو مدلل کر دیا یا تو آگے دوسری شرط کے دلائل کو بیان کیا۔

دوسری شرط: سلسلۂ نبوت کے آپ پر منتہی ہونے کے دلائل:

پہلی دلیل، دلیل عقلی:

حضور اکرم ﷺ کو اگر ہم آخری نبی نہ مانیں بلکہ آپ کے بعد بھی انبیاء کی آمد کو ممکن سمجھیں تو سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئے گا اس کی شریعت حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے مخالف ہوگی یا موافق۔

نئی شریعت مخالف ہوئی تو؟:

اگر اس نئے نبی کی شریعت آپ ﷺ کی شریعت کے, مخالف ہوگی تو یقیناً حضور کی شریعت کو منسوخ کرنے کا تقاضا کرے گی؛ حالانکہ قرآن کہتا: "مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ أَوۡ نُنۡسِهَا نَأۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَا أَوۡ مِثۡلِهَا" جب ہم کسی چیز کو منسوخ کرتے ہیں یا اس کو مٹاتے ہیں تو اس کے بدلے میں اس سے بہتر یا اس کے مماثل چیز لیکر آتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت سے یہ اصول پتہ چلا کہ ناسخ کا اپنے منسوخ سے بہتر ہونا، افضل ہونا ضروری ہے؛ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی غیر افضل نبی، امام الانبیاء کی شریعت کو منسوخ کردے، اگر ایسا ہوا تو یہ شریعت رحمت کی بجائے زحمت بن جائے گی کہ پہلے لوگوں کو ایک افضل چیز کا عادی بنایا پھر اس کو منسوخ کرکے غیر افضل کو نافذ کردیا۔

نئی شریعت موافق ہوئی تو؟:

اگر اس نئے نبی کا دین، دین محمدی کے موافق ہو، تو سوال یہ ہے کہ اس پر نازل ہونے والی وحی کیسی ہوگی، اس کی دو شکلیں ہیں، یا تو من وعن حضور ﷺ والی وحی اس پر بھی نازل ہوگی، یا کچھ مزید اضافوں کے ساتھ؛ اگر بعینہ حضور والی وحی اس پر نازل ہوئی تو ایسی وحی اور ایسے نبی کی ضرورت کیا تھی؟ جب کہ اس سے پہلے جامع العلوم کی مصداق وحی محمدی موجود ہے، اور اگر کچھ مزید اضافے کے ساتھ وحی نازل ہوئی تو اس کا مطلب بعض احکام شرعیہ، فوائد دینیہ ایسے تھے جسے اللہ نے شریعت محمدیہ میں نازل نہیں کیا، سے اب نازل کیا جا رہا ہے، حالانکہ قرآن کہتا ہے: "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ" ہم نے ہر احکام شرعیہ، فوائد دینیہ اس شریعت میں بیان کردیا ہے۔

دوسری دلیل، لفظ خاتم کے ذریعہ:

شروع کتاب میں مولانا نانوتوی نے لفظ "خاتم" کا معنی "آخری نبی" کرنا عوام کا خیال فرمایا تھا، لیکن اس سے یہ شبہہ نہ ہو کہ آپ نے اس معنی کی نفی کی ہے؛ بلکہ پورے کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ لفظ "خاتم" کو "آخری نبی" والے معنی میں منحصر نہیں کرنا چاہتے؛ بلکہ اس معنی کے ساتھ ساتھ آپ ایسا معنی بھی مراد لیتے ہیں جس سے آپ ﷺ کی

فضیلت اورآپ کی تعریف ثابت ہوسکے، چنانچہ سلسلۂ نبوت ﷺ آپ پر منتہی ہونے اورآپ اکے خاتم النبیین ہونے کی دوسری دلیل میں مولانا نانوتوی نے جو کچھ بھی ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں واردشدہ لفظ ''خاتم'' کا معنی تو وہی ہوگا جس سے آپ اکی فضیلت و تعریف ثابت ہوسکے، البتہ بطورعموم مجاز کے ''آخری نبی'' والا معنی بھی اس میں شامل ہوگا یا اس لفظ کا ایسا معنی مرادلیا جائے جس کے اطلاق میں افضلیت والا معنی بھی شامل ہو، اورآخری نبی والا بھی۔ اسطرح یہ آیت سلسلۂ نبوت آپ پر منتہی ہونے کی دوسری دلیل بن جائے گی۔

تیسری دلیل: حدیث رسول

بخاری کی حدیث میں ہے: أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِن مُوسَى، إِلَّا أَنَّهُ لا نَبِيَّ بَعْدِي حدیث پاک کا یہ مضمون تواتر سے ثابت ہے جو آپ کی ختم نبوت کی دلیل ہے۔

چوتھی دلیل: اجماع امت

امت کے ہر فرد کا یہ یقین ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا تو آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے منتہی ہونے کی چوتھی دلیل اس امت کا اجماع ہے۔

خلاصۂ کلام:

موصوف بالذات کے لئے جو دوشرطیں درکار ہوا کرتی ہیں مولانا قاسم نانوتوی نے قرآن وحدیث ک روشنی میں ثابت کیا کہ وہ دوشرطیں حضوراکرم ﷺ میں موجود ہیں لہٰذا آپ کی نبوت کے باب میں موصوف بالذات ہیں، آپ افضل الانبیا ہیں جب کہ دیگر انبیاء کی نبوت عرضی ہے، انھیں آپ ﷺ کے صدقۂ طفیل میں نبوت عطا ہوئی ہے۔

خاتم النبیین کے معنی کی تعیین:

آپ نے شروع کتاب میں عرض کیا تھا کہ تقدم یا تاخر میں بالذات کوئی فضیلت نہیں اس لئے خاتم کا مرادی معنی ''آخر میں تشریف لانے والا'' نہیں ہوسکتا؛ بلکہ کوئی ایسا معنی مراد لیا جائے جو آپ کی فضلیت پر دلالت کرسکے، بالذات، بالعرض کی تمہید کے بعد جس سے تمام

انبیاء کے مابین آپ ﷺ کی فضیلت واضح ہوگئی۔۔۔۔۔آپ نے خاتم النبیین کے معنی سے بحث کرتے ہوئے جوتحریر فرمایا اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

خاتم بمعنی آخر ایک مبہم لفظ ہے خود ہماری اردو زبان میں بھی جب کوئی کہتا ہے ''میں زید کے بعد (آخر) ہوں'' تو مخاطب فورا سوال کرتا ہے، کس لحاظ سے؟ رتبے اور مرتبے کے لحاظ سے؟ مال ودولت کے لحاظ سے؟ زمانے کے لحاظ سے؟ مکان کے لحاظ سے؟ کس لحاظ سے؟

اگر رتبے والا معنی لیا جائے تو پورا جملہ اس طرح ہوگا ''میرا رتبہ زید کے رتبے کے بعد ہے'' اگر زمانے کے لحاظ سے ہوتو پورا جملہ یوں ہوگا ''میرا زمانہ زید کے زمانے کے بعد ہے'' اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں: حضور اکرم تمام نبیوں میں سب سے آخر پر ہیں؛ تو یہاں پر بھی سوال ہوگا کس لحاظ سے سب سے آخر پر ہیں؟ زمانے کے لحاظ سے یا رتبے اور مرتبے کے لحاظ سے؟ اگر زمانے کے لحاظ سے ہوں تو پورے جملے کا معنی ہوگا ''حضور کا زمانہ تمام نبیوں کے زمانے کے بعد ہے'' اور اگر مرتبے کے لحاظ سے ہوں تو پورا جملہ اس طرح ہوگا ''حضور کا رتبہ تمام نبیوں کے رتبے سے آخر (افضل) ہے، بہر حال معنی درست کرنے کے لئے ''خاتم'' کے ساتھ رتبہ، زمانہ یا مکان کچھ نہ کچھ مقدر ماننا پڑے گا۔

مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ اگر لفظ خاتم بمعنی آخر کو ایک جنس قرار دے کر خاتمیت زمانی، خاتمیت مکانی اور خاتمیت رتبی کو اس کی نوع قرار دیں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ جب مقدر ماننا ہی ضروری ہے تو کسی ایک معنی کی تخصیص نہ کرتے ہوئے کوئی عام معنی مقدر لیا جائے جس میں ہر قسم کی خاتمیت مراد ہو: آپ ﷺ کی خاتمیت مرتبی یعنی تمام نبیوں میں سب سے افضل ہونا، آپ کی خاتمیت زمانی یعنی تمام نبیوں میں آپ ﷺ کا آخری زمانے میں تشریف لانا اور آپ ا کی خاتمیت مکانی یعنی اگر سات زمینیں فی الواقع موجود ہوں تو آپ کی زمین کا سب سے آخر میں ہونا۔

(جاری)

❀❀❀❀❀

جنگ آزادی پر ایک طائرانہ نظر

مفتی عبید اللہ شمیم قاسمی

ہندوستان کو انگریزوں کے خلاف ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی ملی، تقریباً ڈیڑھ صدی تک انگریز اس ملک پر قابض رہے اور اس آزادی کے لیے مسلمانوں نے پوری جدوجہد کی اور خاص طور پر بہت سے علمائے کرام نے اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا، اگرچہ جنگ آزادی میں برادران وطن کی بھی شرکت رہی ہے مگر وہ بہت بعد میں شریک ہوئے اور ان کی قربانیاں مسلمانوں اور علماء کرام کی قربانیوں کے سامنے ہیچ ہیں۔

ذرا آج سے سوا چار سو برس پیچھے چلیں اور اس وقت کیا حالات تھے، اس پر ایک نظر ڈالیں: اس وقت ہندوستان ہر طرح کی دولت سے مالا مال تھا اور حرص وہوس بھری نگاہیں اس کی طرف اٹھتی تھیں اور یہاں اپنا قدم جمانے کے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے تھے، ہندوستان دنیا کا صنعتی مرکز تھا دنیا کی آبادی کا پانچ فیصد ہندوستان میں رہتا تھا اور تقریباً ایک چوتھائی مصنوعات یہاں تیار ہوتی تھیں جن میں کپڑے کی اشیاء سرفہرست ہیں۔ دنیا بھر کا سونا اور چاندی انڈیا میں آتا اور یہاں کی اشیا دنیا بھر میں بکتی تھیں حتیٰ کہ سستی انڈین مصنوعات کی دستیابی کی وجہ سے دور دراز کے علاقوں جیسے میکسیکو میں مقامی صنعت تک متاثر ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں معاشی خوشحالی کے باعث اس وقت کا مغل شہنشاہ اکبر دنیا کا سب سے امیر انسان تھا جس کی آمدنی چند تخمینوں کے مطابق آج کے دور کے ۱۰/ارب برٹش پاؤنڈز کے برابر تھی۔

دوسری طرف انگلینڈ قدرے غریب زرعی ملک تھا جو تقریباً ایک صدی تک مذہب جیسے موضوع پر خانہ جنگی کا شکار رہا تھا۔ انگلینڈ میں دنیا کی صرف تین فیصد مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔

مذہبی خانہ جنگی کی وجہ سے یورپ میں انگلینڈ کسی حد تک تنہا ہو چکا تھا اسی تنہائی نے انگلینڈ کے باسیوں کو مجبور کیا کہ دنیا بھر میں کاروبار اور تجارت کے مواقع ڈھونڈیں۔

اسی وجہ سے انگریز قوم ہندوستان میں تجارت کی غرض سے داخل ہوئے اور یہاں آ کر انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر لی اور دھیرے دھیرے اس ملک پر قابض ہو گئے، جانباز مرزا تحریر فرماتے ہیں:

''مہمان بن کر آنے والے جب حاکم بن بیٹھے تو اپنے تخت پر اس قدر اتراتے کہ ابلیس کے ہم دوش ہو کر انسان کو غلام بنا کر بھی ان سے حیوانوں کا سا برتاؤ کرنے لگے، عوام نئے حاکموں سے دست و گریبان ہونے کے بہانے تلاش کرنے لگی''۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام:

انگریز ملاح دسویں صدی ہجری (سولہویں عیسوی) کے آغاز ہی میں ہندوستان پہنچنے کی فکر میں تھے۔ کئی مرتبہ بحری راستے سے پہنچنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے ۱۵۸۴-۸۳ء میں انگلستان کے چار سوداگر ہندوستان پہنچے، مگر گوا کے پرتگیزوں نے انہیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا، آخر کار انہیں رہائی مل گئی اور ایک شخص بہت سی مشکلات کے بعد وطن پہنچ گیا۔ لیکن انگریزوں کی ہندوستان سے تجارت کا اصلی آغاز ہسپانیہ کے بحری بیڑے ارمیڈا کی تباہی کے بعد ہوا اور انہوں نے ملکہ الزبیتھ سے درخواست کی کہ انہیں بھی ممالک ایشیاء میں تجارت کی اجازت دی جائے۔ ان کی یہ درخواست منظور ہوئی اور ان سوداگروں نے تین جہاز ہندوستان روانہ کئے، جن میں سے ایک راستہ میں ڈوب گیا اور دو جہاز جنوبی ہند پہنچے، یہی انگریزوں کے پہلے جہاز تھے جو پرتگیزوں کے دریافت کردہ راستے سے ہندوستان پہنچے۔ (تاریخ ہند سوم، صفحہ:۲۲۶)

یہ ۱۶۰۰ء کا واقعہ ہے، جب تاجروں کی اس جماعت کو پندرہ سالہ ایک میعادی حکم نامہ سلطنت انگلستان کی طرف سے عطا کیا گیا۔

انگریز مورخ سر جان میلکم نے ان تاجروں کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت

انصاف سے لکھا ہے:

''ابتدا میں اس جماعت کو بذریعہ منشور محض تجارت کرنے اور بزور شمشیر اپنے مال کی حفاظت کرنے کا اختیار اور حق عطا کیا گیا تھا، لیکن چند ہی سال کی مدت میں وہ اپنے گماشتوں اور کارندوں کی جد وجہد اور اولوالعزمی، دیگر اقوام یورپ کی حریفانہ سرگرمی اور والیان ملک کی کمزوری اور ریاکاری کی بدولت بہت جلد شاہی اختیارات کی مالک بن بیٹھی، اور ان والیان ملک کی نظر میں یہ جماعت اپنی غاصبانہ حرکتوں یا تمول کی وجہ سے رشک کرنے یا لوٹنے کے قابل ایک چیز ہوگئی''۔ (سیاسی تاریخ ہند، حصہ اول صفحہ:۱)

آگے لکھتا ہے:

''سچ تو یہ ہے کہ جس دن کمپنی کی فوجیں اپنے کارخانوں سے آگے بڑھیں، اسی دن سے اپنے علاقوں میں توسیع اور اپنی فوجوں میں اضافہ کرنا ان کی حفاظت کا اصول بن گیا''۔

مگر اہل کاران کمپنی حدود سے بہت آگے نکل گئے اور اپنی حفاظت کے نام پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا، یہاں تک کہ ان کے مظالم کی بازگشت لندن تک سنی گئی۔

تمام مورخین نے باتفاق یہ بات لکھی ہے کہ مسیحیت کی تبلیغ وترویج ان کا بنیادی مقصد تھا، انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے جو زیادتیاں کیں وہ ناقابل بیان ہے۔ مصاحف اور کتابوں کو روندتے اور ان میں آگ لگاتے، مساجد اور شعائر کی بے حرمتی کرتے، عیسائیت قبول کرنے اور صلیب کو سجدہ کرنے پر مجبور کرتے، اس کے لیے مال کا لالچ دیتے، مسلمان عورتوں کو برگشتہ کرنے کے لیے اپنی عورتوں کو زیورات اور نفیس کپڑوں سے آراستہ کرتے، حجاج اور دوسرے مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر مار ڈالتے۔

مغل بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی ۱۷۰۷ء میں وفات کے بعد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی اس ملک کے دروبست پر قابض ہوگئی تھی۔ ملک بادشاہ سلامت کا تھا، مگر ہر طرف کمپنی بہادر کا ہی حکم چلتا تھا۔ انگریزوں نے پیہم سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی بدولت وطن عزیز پر اپنا ناپاک تسلط جمالیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی لیکن اس

کے بعد یہ کمپنی ختم کردی گئی اور اس کے تمام اختیارات تاج برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ کی جنگ ہو یا ۱۸۵۷ء کی عظیم اور ہمہ گیر جنگ آزادی (جسے کمال چالاکی سے غدر کا عنوان دے دیا گیا ہے) ہر محاذ پر مسلمان اور علماء ہی جنگ آزادی کے قافلہ سالار تھے۔ اس کفن بردوش قافلے میں بہت سے اہل وطن بھی شامل تھے، ہندو بھی تھے اور سکھ بھی، مگر ہراول دستہ یہی مسلمان اور علمائے دین تھے، وہ ہر حالت میں اور ہر قیمت پر وطن عزیز کو انگریزوں کے ناپاک سائے سے پاک کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ ہندستان کی جاہ وحشمت اور دولت وثروت ہر چیز انگریزوں نے بہ تدبیر چھین لی تھی۔ ساتھ ہی ہندستانی علماء اور مسلم مجاہدین آزادی کو اس کا بھی شدید احساس تھا کہ اگر انگریزوں کو ملک بدر نہیں کیا گیا تو اس کے ہندستانی معاشرے اور سماج پر خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ نہ صرف یہ کہ موجودہ نسل اپنی متاع دین وایمان سے محروم ہوکر عیسائیت کے چنگل میں گرفتار ہوجائے گی، بلکہ آئندہ نسلیں بھی عیسائیت کے ہم رنگ زمیں دام میں پھنس کر سرمایۂ دین سے محروم ہوجائیں گی۔ آخرش ان کی دوسوسالہ مشترکہ طویل جدوجہد کام لائی اور ملک کے افق پر ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی کا سورج طلوع ہوا، مگر وہ خون آلود اور تقسیم کے زخموں سے چور تھا۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار تاریخِ ہند میں سنہرے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ باب مسلمانوں کی جذبۂ حب الوطنی، جوش وولولہ، عزم وہمت، بہادری و پامردی، ایثار وقربانی کی لافانی وناقابلِ فراموش داستان ہے۔

تقریباً دوصدی تک چلنے والی تحریکِ آزادی میں مسلمانانِ ہند نے بے مثال اور لازوال کردار ادا کیا اور وطنِ عزیز کو غاصب انگریزوں کے پنجۂ ظلم اور باشندگانِ ہند کی گردنوں کو طوقِ غلامی سے آزاد کروانے کے لئے اپنی جان و مال، عزت وآبرو کی وہ عظیم قربانیاں پیش کیں جن کا تذکرہ کئے بغیر تاریخِ ہند نامکمل ہے۔

قلم اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ، تاریخ کو جنم دیتے ہیں، قومیں جب حقوق کی میز پر آمنے سامنے بیٹھتیں ہیں تو وہاں ووٹ نہیں، لاشیں شمار کی جاتی ہیں۔ جس قوم کی لاشیں اپنے

حقوق کے حصول میں زیادہ ہوں گی وہی ہراول دستہ کہلائے گی۔ ہندوستان میں فرنگی سامراج کے خلاف جد وجہد آزادی میں پہل مسلمانوں نے کی۔ انگریز کے خلاف عسکری جنگ مسلمانوں نے لڑی۔توپوں کے دہانوں کے ساتھ باندھ کر مسلمان اڑائے گئے۔ پھانسی کے تختے پر انقلاب زندہ باد مسلمانوں نے کہا۔ جزائر انڈومان کو انگریز کے باغی مسلمانوں نے آباد کیا۔

فتح علی عرف ٹیپو سلطان:

جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں میں نمایاں نام سلطان ٹیپو شہید کا بھی ہے، جس نے ۱۷۸۳ء تا ۱۷۹۹ء تک اقتدار سنبھالا، اس وقت یہ دور ہندوستان میں انتشار کا دور تھا۔ اور مسلسل انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔

''چراغ بے داغ ہو تو آئینے کی شہادت کی ضرورت نہیں پڑتی، ضمیر زندہ ہو تو کسی پر بد اعتماد ہونے کو جی نہیں چاہتا''۔

میر صادق اور ایک ہندو وزیر سب سے پہلے اپنے آقا کے قتل میں انگریز کے آلہ کار بنے۔ سلطان کا گھڑسوار فوج کا کورکمانڈر بدرالزمان انگریز سے جاگیر کے لالچ میں سودا کر چکا تھا، انگریزوں نے وزیر اعظم میر صادق اور کئی امراء کو ملا لیا اور ریاست پر بڑی فوج سے حملہ کر دیا۔ ٹیپو سلطان قلعہ میں محفوظ تھا، مگر غداروں نے دروازہ کھول دیا، انگریزی فوج قلعہ میں گھس آئی، ٹیپو سلطان بڑی دلیری سے لڑتا ہوا شہید ہوا، سلطان کی شہادت کے بعد انگریز نے قلعہ اور محلات پر قبضہ کر لیا، سلطان کا جھنڈا اتار کر انگریز نے اپنا جھنڈا لہرا دیا، اس کے بعد ایک جنرل نے کہا:

''آج ہندوستان کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی، اب دنیا کی کوئی طاقت ہندوستان کو ہماری غلامی سے نہیں بچا سکتی''۔

انگریز کی بظاہر پالیسی رہی کہ بادشاہ دہلی کو تخت وتاج کے ساتھ جوں کا توں رہنے دیا گیا، لیکن ملکی اختیارات تمام کے تمام ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے تسلیم کرا لئے گئے، اس طرح یہ اعلان ہونے لگا:

''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، اور حکم کمپنی (یعنی انگریز) بہادر کا''۔

ان مشکل ترلمحوں میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلی رحمہ اللہ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ہندوستان کو دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیدیا، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کا فتویٰ مسلم عوام کے دلوں میں جہاد کی آگ روشن کر چکا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتوی کے بعد ان کے شاگردوں نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں اور تیزی پیدا کردی، حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی اور حضرت شاہ اسماعیل صاحب شہید نے ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا، حضرت سید احمد شہید دورہ کرتے ہوئے ہمارے مشرقی یوپی وارانسی اور غازی پور بھی آئے، ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کی لڑائی میں یہ دونوں حضرات شہید ہوئے، مگر علماء خاموش نہیں بیٹھے، بلکہ انگریزوں کے خلاف طاقت جمع کرتے رہے اور ۱۸۵۷ء کا جہاد ہوا، اس میں بھی علماء کو بظاہر ناکامی ملی، اس کے بعد انگریز اپنے مشن کو نافذ کرنے کے لیے اور تیز ہوگئے، مجاہدین آزادی کی اولادیں جن کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ضروری سامان نہیں تھے، کوئی بالغ مرد نہیں تھا جو کما کر ان کا پیٹ بھرتا، عورتیں بیوہ ہوگئی تھیں، ایسے وقت میں انگریز مبلغ ان بچوں کے گھر والوں سے کہتے یہ بچہ ہمیں دیدو، اسے ہم مفت پڑھائیں گے اور مفت کھلائیں گے، اس طرح بہت تیزی کے ساتھ عیسائی مشنریاں عیسائیت کی تبلیغ کررہی تھیں، ایسے حالات میں اس وقت کے علماء سر جوڑ کر بیٹھے کہ کیا کریں اور راتوں کو دعائیں مانگتے تھے، چنانچہ انہیں حالات میں ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، جو ایک تعلیم گاہ بھی تھی، تربیت گاہ بھی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد ملک سے انگریزوں کے ناپاک قدم کا خاتمہ بھی تھا۔

اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ آزادی کی لڑائی میں سب سے زیادہ قربانی مسلمانوں کی رہی، سب سے اہم اور بے مثال کارنامہ مسلمانوں نے انجام دیا اور سب سے آگے آگے علماء کرام رہے۔ اگر آزادی ہند میں مسلمان اور خصوصا علماء کرام حصہ نہ لیتے تو ہندوستان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا، تحریک آزادی نہ چلتی، تحریک بالاکوٹ کا وجود نہ ہوتا،

تحریک ریشمی رومال کی بنیاد نہ پڑتی، تحریک خلافت کا غلغلہ نہ ہوتا، ہندستان چھوڑ وتحریک کا زور وشور نہ ہوتا، اگر مسلمانوں نے اپنے پاکیزہ لہو سے شجرآزادی کی آبیاری نہ کی ہوتی اور اپنے خون جگر سے عروس آزادی کی حنابندی نہ کی ہوتی تو آج ہم آزادی نہیں منا پاتے۔

ہم یہ نہیں کہتے اور یہ کہنے کا ہمیں بالکل جواز نہیں ہے کہ ہمارا یہ ملک صرف ہماری ہی کوششوں سے آزاد ہوا ہے ایسا کہنا تاریخ کو منھ چڑھانا ہوگا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آزادی کا صور مسلمانوں نے پھونکا، انگریز کے خلاف جہاد کا فتوی علماء نے دیا، آزادی کی لڑائی کی شروعات مسلمانوں نے کی اور جب اس چنگاری نے شعلہ کی شکل اختیار کر لی تو برادران وطن بھی ہمارے ساتھ ہو گئے اور پھر انھوں نے بھی شانہ بشانہ ہمارا ساتھ دیا اور ہر طرح سے اس لڑائی میں کود گئے۔

ہمارے اسلاف نے اس ملک کی آزادی کے لئے تحریکیں چلائیں، قیدوبند کی صعوبتوں کو برداشت کیا، کمالِ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے تختۂ دار پر چڑھ کر بخوشی پھانسی کے پھندے کو گلے سے لگایا، لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کیا تب کہیں جا کر اس ملک کو انگریزوں کے پنجۂ غلامی سے آزادی ملی اور یہ ملک آزاد ہوا۔ لیکن افسوس...

جب پڑا وقت گلستاں پہ تو خوں ہم نے دیا
جب بہار آئی تو کہتے ہیں تیرا کام نہیں

جن مسلمانوں نے آزادی کے لئے سرگرم اور قائدانہ رول ادا کیا تھا اُنہی مسلمانوں کے ساتھ آزادی کے بعد سوتیلا سلوک کیا جانے لگا۔ ہماری قربانیوں کو فراموش کر دیا گیا، جب بھی جنگِ آزادی کی بات ہوتی ہے تو دو چار مسلمانوں کا ذکرِ محض کر کے خانہ پُری کر دی جاتی ہے اور اُن لاکھوں مسلمانوں کا ذکر تک نہیں کیا جاتا جنہوں نے اس ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانوں کی قربانی دی۔

آج ہم یہ عہد کریں کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں اور خصوصاً علماء کرام کی قربانیوں سے ہم نئی نسل کو روشناس کرائیں گے تا کہ ہماری آنے والی نسل اپنے بزرگوں کی قربانیوں سے واقف ہو۔

سال نو: جشن بہاراں بھی اور محاسبہ نفس بھی

ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی

کائنات کے جاری و ساری نظام کے مطابق زندگی کے ایام متعدد مراحل سے گزرتے ہوئے ماہ و سال میں بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حیات انسانی کبھی بہار سے لطف اندوز ہوتی ہے تو کبھی خزاں کی زد میں ہوتی ہے۔ جس طرح سے رات کی سیاہی اپنی چادر پھیلا کر بالآخر نئی صبح کی نوید سناتی ہے اور موسم خزاں اپنا سفر طے کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود بہار کو پا لیتا ہے بالکل اسی طرح انسان گردش ایام کا سامنا کرتے ہوئے کبھی فرحت و مسرت کا ہم رکاب ہوتا ہے تو کبھی غم و آلام سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

زندگی کے نشیب و فراز اور مدو جزر سے گزرتے ہوئے انسان اپنی ذہنی تسکین کی خاطر ہمہ وقت جشن و تقریبات کا اہتمام کرتا نظر آتا ہے۔ لہذا انہی فرحت و انبساط کے مواقع میں سے ایک سال نو کا جشن جو دور جدید میں عام طور پر پہلی جنوری کو منایا جاتا ہے، جس میں حیا و اسلامی شعائر کو بالائے طاق رکھ کر بے باکانہ خرمستیاں کی جاتی ہیں اور یہ بیہودگیاں اسلام کے زریں اصولوں کو پلید کرتی نظر آتی ہیں جو امت مسلمہ کے لئے درس عبرت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر قوم کے لئے ان کا اپنا کیلینڈر رہوتا ہے جسے وہ کسی نہ کسی واقعے سے جوڑ کر اپنے سال کا آغاز کرتی ہے۔ یہ تمام تقریبات کچھ خاص واقعات اور خاص مفلوک الحال گروہوں کی یادداشت میں منائی جاتی ہیں جہاں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ محض اس خاص دن میں فلاں طبقہ تعظیم کے لائق ہے اور فلاں شخص قابل احترام ہے۔

مگر افسوس امت کی اس حالت زار پر کہ وہ اندھا دھند غیروں کی نقالی پر آمادہ ہے اور اس سنہری اصولوں سے غافل ہے جس سے مذہب اسلام مزین ہے۔ یہاں تک کہ امت کے بیشتر افراد

اسلامی مہینوں کے نام اور اس کے آغاز اور ہجری کیلنڈر کی ترویج کے اسباب وعوامل سے نابلد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دن کے جشن سے اپنے آپ کو حقوق انسانی کا علمبردار گردانتے ہیں اور بھول جاتے ہیں رب کریم کے بے پایاں احسانات کو جو وہ ہمیں اسلام کی صورت میں عطا کر کے ہر لمحہ عدل وانصاف، دست گیری وخدمت گزاری اور حقوق العباد کی ادائیگی کا پابند بناتا ہے۔

عیسوی سال نو کا جشن مسلمانوں کی ملی روایات کے خلاف ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس جشن کا انعقاد محرم الحرام کی پہلی تاریخ کو ہونا چاہیے مگر چونکہ آج انگریز قوم اپنی سائنس و ٹیکنالوجی اور صنعت وحرفت کے بل بوتے پر فاتح اقوام بنی بیٹھی ہے جب کہ فاتح اقوام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے قانون وقاعدے، معاشرت وعمرانیات اور تہذیب وتمدن اپنی زیراثر رعایا پر مسلط کر دیتے ہیں۔لہذا موجودہ حالت میں اگر مسلمان بالکلیہ اسلامی کیلنڈر کے مطابق اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھائیں تو وہ باقی دنیا سے کٹ جائیں گے لہذا دنیوی امور میں اس عیسوی کیلنڈر کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ شمسی وقمری نظام اللہ کا ہی بنایا ہوا ہے مگر چونکہ اسلامی عبادات واحکامات قمری نظام کے تحت ہیں لہذا اس ہجری حساب کو یکسر فراموش کرنا ہرگز جائز نہیں۔اس سلسلے میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

”چونکہ احکام شریعت کا مدار حساب قمری پر ہے، اس لئے اگر ساری امت دوسری اصطلاح کو اپنا معمول بنالے جس سے قمری حساب ضائع ہو جائے تو سب گنہگار رہوں گے اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی مباح ہے، لیکن سنت سلف کے خلاف ضرور ہے اور حساب قمری کا برتنا بوجہ اس کے فرض کفایہ ہونے لابد افضل واحسن ہے“۔

اب سے کچھ ہی دنوں میں ہم ایک محترم مہینے میں داخل ہونے جارہے ہیں جو اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے جو ہمارے لئے جشن بہاراں کی نوید سناتا ہے۔لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم تقویم ہجری کے اسباب وعوامل پر غور کریں اور اس مہینے کی فضیلت وتقدس کو سمجھیں اور پھر زندگی کا ایک لائحہ عمل تیار کریں کہ آیا ہم نے رب کائنات کی اس عظیم نعمت کا شکر ادا کیا یا نہیں؟ آیا یہ موسم جشن کا ہے یا محاسبہ نفس کا؟ تقویم اسلامی کا تعین امت مسلمہ کے لئے عظمت ورفعت اور فتح ونصرت کا عملی پیغام ہے۔جیسا کہ محمد علاء الدین ندوی رقم طراز ہیں:

''تقویم ہجری کے لئے وہ (صحابہ کرام) ولادت رسول کے واقعے کو بھی منتخب کر سکتے تھے لیکن اس کا امکان تھا کہ اس کے اختیار کرنے میں شخصیت کا عکس جھلکتا۔ پھر اس صورت میں خطرے کا بھی امکان تھا کہ دعوت اسلامی کا حصہ شخصیت پرستی کے آئینہ میں چھپ جاتا۔ ان کے سامنے بعثت کا واقعہ بھی تھا لیکن وہ تحریک اسلامی کا نقطۂ آغاز تھا۔ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کی بیعتیں تھیں لیکن یہ کوئی فیصلہ کن موڑ نہ تھیں۔ بدر، حدیبیہ، فتح مکہ کی فتوحات تھیں لیکن یہ بنیادیں نہ تھیں۔ بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچے تھے۔ حجۃ الوداع کا عظیم الشان اجتماع فتح ونصرت کا آخری باب تھا لیکن یہ فتح وبشارت کا موقع بھی ہجرت کا رہین منت تھا''۔

تقویم ہجری کے اسباب پر الحافظ احمد بن علی تجزیہ کرتے ہوئے تمام واقعات پیش کرتے ہیں جس میں سے ایک واقعہ بطور خاص پیش خدمت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت ابوموسیٰ اشعری (جو یمن کے گورنر تھے) نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ہمارے نام آپ کی طرف سے ایسی دستاویز آتی ہیں جن میں تاریخیں نہیں ہوتیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کو بلوایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ بعض لوگوں نے یہ رائے دی کہ بعثت نبوی سے سن کا آغاز ہو۔ بعضوں نے کہا کہ واقعہ ہجرت سے ابتدا کی جائے۔ حضرت عمر نے فرمایا ہجرت حق وباطل کے درمیان فرقان ہے لہذا اسی سے تاریخ سن کی ابتدا کرو''۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باہمی مشورے سے ہجرت کو حق وباطل کے درمیان تمیز کی بنیاد بنا کر مسلمانوں کے قومی وملی تشخص کو اجاگر کیا۔ ہجرت جو کہ دین اسلام کے فروغ کی اساس ہے اس سے ہجری سال کا آغاز کیا گیا اگرچہ مہینوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اور عربوں میں رائج محرم الحرام کو ہی پہلا مہینہ قرار دیا گیا اور اس طرح ۱۷ ہجری سے قبل تمام سالوں کو زیرو کر دیا گیا۔

یہ مہینہ مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہے:

یہ وہ مہینہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عظمت وعزت سے نوازا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

السنة اثنا عشر شهراً منها أربعة حرم. ثلاثة متواليات ذو القعده و ذو الحجه و المحرم و رجب مضر الذی بین جمادی و شعبان.

ترجمہ: سال میں بارہ مہینے میں ہوتے ہیں جن میں چار مہینے حرمت والے ہیں، ان میں سے تین ذوالقعدہ، ذوالحجۃ اورمحرم متواتر ہیں اور رجب مفرد ہے جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے۔ یہ مہینہ رسول ا کا پسندیدہ مہینہ ہے۔

عبداللہ بن عباس ہ فرماتے ہیں:

"ما رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتحری صیام یوم فضله علی غیر إلا هذا الیوم یوم عاشوراء و هذا الشهر یعنی شهر رمضان".

ترجمہ: میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص دن روزہ کا اہتمام کرتے ہوں اور اس کو کسی دوسرے دن پر فضیلت دیتے ہوں سوائے دس محرم کے دن کے اور اس مہینہ یعنی رمضان المبارک کے مہینہ کے۔

یہ مبارک مہینہ گناہوں سے معافی کا مہینہ ہے۔ عبداللہ بن عباس ہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"صیام یوم عاشوراء احتسب علی اللہ أن یکفر السنة التی قبله".

ترجمہ: میں یہ گمان کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس دن یعنی عاشوراء کا روزہ رکھنے والے کے گزشتہ سال کے گناہ معاف کردیتا ہے۔

روزہ رکھنے کے اعتبار سے یہ مہینہ رمضان کے بعد سب سے افضل مہینہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے معزز مہینہ ہے کیونکہ اس کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ اور یہ اعزاز سال کے کسی اور مہینے کو نہیں نصیب ہوا۔ حضرت ابوہریرہ ہ فرماتے ہیں کہ نبی ا نے فرمایا کہ:

"افضل الصیام بعد رمضان شهر اللہ الذی تدعونه المحرم".

ترجمہ: رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ اللہ کے اس مہینے کا روزہ ہے جسے تم محرم کہتے ہو۔

یہ وہ مہینہ ہے جس میں اللہ نے ایک قوم کی توبہ قبول کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے لشکر سے نجات دی۔ اور دوسری قوموں کی بھی توبہ قبول کرنے کی بشارت دی۔

رسول اکرم ﷺ نے جہاں اس کی عظمت کو بیان کیا وہیں قرآن مجید نے اس بات کا حکم دیا کہ: "فلا تظلموا فیهن انفسکم"۔

لہٰذا ان مہینوں میں جنگ وجدل کی ممانعت کردی۔ اور سب سے بڑا ظلم و زیادتی یہ

ہے کہ انسان رب العزت سے دور ہوجائے اور اپنے آپ کو گناہوں سے قریب کر لے۔

ان تمام فضائل کے پیش نظر ہمارے لئے سال نو یکم محرم الحرام جشن بہاراں کا دن ہے جسے ہم بطور شکر خداوندی فرحت ومسرت کے ساتھ گزارنے کے اہل ہیں کہ اللہ نے ہمیں ایک سال اور فراہم کئے جس میں ہم ان نعمتوں سے مستفید ہوسکتے ہیں جنہیں اللہ نے ہمارے لئے خاص کر دیا ہے۔ مگر اس کا طریقہ کار محض اسلامی شعائر کے مطابق سجدہ شکر وحمد کی صورت میں ہو اور ساتھ ہی محاسبہ نفس کا آغاز بھی کہ گزشتہ سال ہمارے نامہ اعمال میں کتنی نیکیاں اور کتنی برائیاں لکھی گئیں؟ کیا ہم نے یہ سال ایسے نیک اعمال میں گزارے کہ کل قیامت کے دن ان کو دیکھ کر خوش ہوسکیں اور جو ہمارے لئے دونوں جہاں میں نفع بخش ثابت ہوں؟ یا ہم نے اپنے دن ایسے گزارے جو ہماری دنیا وآخرت کی ناکامی کا ذریعہ بنیں گے؟

ہماری عبادت وریاضت، اطاعت وطریقت احکام الٰہی کے مطابق رہیں یا پھر سود وزیاں کا باعث؟ ہمارے صدقات وزکوٰۃ، فرائض ونوافل ہمارے نفس میں خشوع وخضوع کا باعث بنے یا محض عادتاً انجام دیا گیا کہ تمام تر مشقت کے باوجود نامہ اعمال میں بڑھوتری کا سبب نہ بن سکے؟

معیشت ومعاشرت اور اخلاقیات کے میدان میں ہمارے اخلاق نبی ﷺ کرم ا کے اخلاق کا نمونہ بنے یا نہیں؟ حقوق العباد مثلاً والدین، رشتہ داروں، پڑوسیوں، یتیموں اور بیواؤں وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کو ہم نے اپنا فرض منصبی سمجھا یا نہیں؟ اولاد کی تربیت کے معاملے میں ہم نے فرامین الٰہی کو مقدم رکھا یا محض دنیوی مقاصد کے حصول میں انہیں سرگرداں رکھا؟ حصول علم اور اس کے تقاضے کو مدنظر رکھا یا پس پشت ڈال دیا؟ غرضیکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تئیں ہم سنجیدہ ہوئے یا محض حیوانی طرز عمل کو اختیار کرتے ہوئے زندگی کے مقاصد سے بے خبر روز وشب گزارنے میں مشغول ہیں؟ علاوہ ازیں سال نو ہجرت کے عظیم واقعہ کی یاد دلا کر اس عہد کی تجدید کرتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو دین حق کی سربلندی کے لئے مصائب وآلام سے دوچار ہونا پڑے تو ایسے پرآشوب دور میں کفر کے ساتھ رواداری کا رویہ اپناتے ہوئے اپنے عقائد ونظریات میں لچک نہ پیدا ہونے دیں خواہ اس کے لئے جان ومال کی قربانی ہی

کیوں نہ دینی پڑے۔ یہ وقت ہے اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کا تا کہ ہم عنداللہ محبوب ہوسکیں اور وقت سے پہلے اپنے رب کو راضی کر سکیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

پانچ امور سے قبل پانچ امور سے فائدہ اٹھایا جائے۔(۱) بڑھاپا آنے سے قبل جوانی سے (۲) مرنے سے قبل زندگی سے (۳) مشغلات سے قبل فراغت سے (۴) غربت آنے سے قبل مال سے (۵) بیماری سے قبل صحت سے۔

اسی طرح حضور ﷺ نے ارشادفرمایا کہ قیامت کے دن کسی انسان کا قدم اللہ تعالیٰ کے سامنے سے نہیں ہٹ سکتا یہاں تک کہ وہ مذکورہ سوالات کا جواب دیدے۔

زندگی کہاں گزاری ؟ جوانی کہاں لگائی ؟ مال کہاں سے کمایا ؟ یعنی حصول مال کے اسباب حلال تھے یا حرام؟ مال کہاں خرچ کیا؟

یعنی مال سے متعلق اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کئے یا نہیں؟ علم پر کتنا عمل کیا؟ لہذا یہ وقت ہے کہ ہم عیسوی سال کا جشن منانے کے بجائے یکم محرم کو سال نو کا درجہ دیتے ہوئے اس کا بحسن وخوبی استقبال کریں اور یاددہانی کے طور پر اسی دن کو مبارکباد کا حصہ بنائیں تا کہ ہر نفس ایک طرف ایک سال اور ملنے پر سجدہ شکر بجالانے کا اہتمام کرے وہیں عمر کا ایک سال کم ہونے پر محاسبہ نفس کا عمل بھی جاری رکھے اور پھر اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں سے اجتناب برتنے کا عزم مصمم بھی کر لے اور رب کائنات کی بارگاہ میں دعا گو بھی اور ساتھ ہی تجدید عہد کرتے ہوئے عقائد ونظریات کو اپنے دلوں میں راسخ کر لے۔ اگر چہ معاشی ومعاشرتی اقدار سے جڑنے کے لئے بعض معاملات میں عیسوی کیلنڈر کے استعمال پر بھی کوئی قباحت نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی کے مقصد کو سمجھنے اور وقت کی قدر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مراجع ومصادر:

قرآن کریم
حدیث شریف
فتح الباری، حافظ ابن حجر العسقلانی،
دار الایان للتراث
ہجرت مصطفی، محمد علاء الدین ندوی،

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

شرف الدین عظیم الاعظمی

پندرہ اگست کا دن بھارت کے لئے وہ یادگار لمحہ اور سنہری تاریخ ہے جس میں صدیوں کی غلامی کی زنجیریں سرفروشان حریت کے انقلابی نعروں سے پگھل گئی تھیں اور کئی صدی پر ملک کی فضاؤں پر پھیلی ہوئی ظلم و جبر کی تاریکیوں میں آزادی کا سورج طلوع ہوا تھا، یہ وہ ساعت ہے جس میں برطانوی سامراج نے رخت سفر باندھا اور بھارت ایک آزاد ملک کی صورت میں دنیا کے نقشے پر ابھرا تھا۔

آزادی کی یہ نعمت اہل وطن کو یونہی مفت میں حاصل نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے پیچھے شمع آزادی کے پروانوں اور وطن کے متوالوں کی ایک طویل، حیرت انگیز، صبر آزما، اور جانکاہ جد وجہد، سرفروشیوں، قربانیوں کی ایک داستان بھی چھپی ہوئی ہے، لیکن آزادی وطن کے لیے مجاہدین حریت کے نثار ہونے، قربان ہونے اور متاع حیات لٹانے کی تاریخ جس قدر روشن ہے اس سے بڑی سچائی اور روشن حقیقت اس ملک کے تحفظ کے لئے، اس کی آزادی کے لئے مسلمانان ہند کی قائدانہ سرگرمیوں، سرفروشانہ قربانیوں اور مجاہدانہ جاں نثاریوں کی ایک وسیع کائنات اور طویل داستان کا وجود ہے، جو اس سرزمین کے ایک اک ذرے میں پیوست ہے، جس کے نقوش تاریخ کے اوراق کے علاوہ ملک کی فضاؤں میں، اقتدار وعدالت کے ایوانوں میں اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یادگار ملک میں بے شمار قلعہ جات کی فصیلوں پر تابندہ ہیں، یہ اور بات ہے کہ جمہوری حکومت کی سطح پر تعصّبات کے پردے ڈال کر ان نقوش کی تابندگی کو مکمل طور سے چھپا دیا گیا، تاکہ آنے والی نسلیں یکسر طور سے اس حقیقت سے بے خبر رہیں۔

عام طور سے مشہور ہے کہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوئی ہے جبکہ حقیقت

یہ ہے کہ اس کی ابتداء پندرہویں صدی کے اواخر میں ہی اس وقت ہوچکی تھی جب ۱۶۰۰ء میں پرتگالی بیڑے ارمیڈا کی تباہی کے بعد واسکوڈی گاما کے متعارف کردہ راستے سے انگریزوں کا اس ملک میں داخلہ ہوا، انھوں نے ملکہ برطانیہ سے براعظم ایشیا میں تجارت کا فرمان لیکر سن ۱۶۰۰ء میں قدم رکھا، اور تیز رفتاری سے اپنی تجارت اور مصنوعات کو فروغ دے کر جنوبی ہند اور بنگال کے علاقوں پر نہ صرف اپنی اقتصادی برتری حاصل کی بلکہ نصف صدی کے گذرنے تک سیاسی اعتبار سے بھی استحکام حاصل کرلیا، تاہم اورنگزیب کے عہد تک ان کا سیاسی دائرہ محدود اور سرگرمیاں رازدارانہ انداز میں تھیں، سولہویں صدی کے اختتام تک جبکہ سلطنت مغلیہ بیمار اور بے جان ہوچکی تھی ان کے اصلی چہرے سامنے آئے، اور سب سے پہلے صوبہ بنگال پر مختلف قسم کے ٹیکس کے ذریعے اس پر قبضہ کی کوششیں شروع ہوئیں، اور نواب سراج الدولہ کے زمانے میں پورے اسٹیٹ میں سازشوں کا جال بچھا دیا، اور پھر فتح کے یقین کے ساتھ ۱۷۵۴ء میں برطانیہ کی پوری قوت کے ساتھ انگریز نواب سراج الدولہ کے نانا علی وردی خان کے سامنے آئے مگر اس میں انہوں منھ کی کھانی پڑی علی وردی خان نے کمال بہادری سے فورٹ ولیم جو انگریزوں کا سیاسی مرکز تھا حملہ کر کے انہیں اس قلعے سے بھگا دیا علی وردی خان کے بعد جب اقتدار نواب سراج الدولہ کے ہاتھوں میں آیا تب تک پورا خطہ اندرونی سازشوں کے باعث کھوکھلا ہوچکا تھا لیکن باوجود اس کے وطن کا یہ جانباز ان کے سامنے ڈٹا رہا ۱۷۵۷ء میں باقاعدہ انگریزی افواج جو خاص طور برطانیہ سے بھیجی گئی تھی بہادری سے داد شجاعت دی مگر میر جعفر اور دوسرے امرا کی غداری کی وجہ سے شکست ہوئی اور وطن کا یہ جانباز مجاہد مرشد آباد میں شہید ہوگیا، پلاسی کے نام سے اس جنگ کے بعد اور میر جعفر کے داماد میر قاسم کی تحریک پر شجاع الدولہ امیر اودھ کے زیر کمان بکسر کی منظم جنگ آزادی اور اس میں انگریزوں کی فتح کے بعد کے بعد بنگال اوڑیسہ سے لیکر اودھ کے پورے علاقوں پر انگریزی سامراج کا قبضہ ہوگیا۔

شیر میسور سلطان ٹیپو کی جوانمردی اور شہادت:

داستان آزادی کا ایک نہایت روشن باب فرمانروائے میسور حیدر علی اور ان کے بیٹے

سلطان ٹیپو شہید کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور سرفروشانہ قربانیوں پر بھی مشتمل ہے، ریاست میسور اپنے نظم وضبط اور طاقت وقوت کی وجہ سے انگریزوں کے لئے بہت بڑی چٹان تھی، حیدرعلی پر انگریزوں کے حملے اور پھران کی شکست فاش سے انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر بھاری ہے تو وہ سازشی طریقہ یہاں بھی اختیار کیا جو سراج الدولہ کے خلاف اپنایا تھا، ۱۷۸۳ر میں انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے خلاف پوری تیاری کے ساتھ میدان میں آئے مگر سلطان ٹیپو کی شجاعت و بہادری کے سیلاب کے آگے انہیں سخت ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑا، انگریز اس شکست کا انتقام لینے کے لئے بے چین تھے، اس غرض کے لیے انھوں نے نظام حیدرآباد کو اعتماد میں لیا، مرہٹوں کو اپنے موافق کیا اور تمام تیاریوں کے ساتھ سرنگا پٹم کا محاصرہ کیا محاصرے کی طوالت کی وجہ سے سلطان ٹیپو صلح کرنے پر مجبور ہوا بطور تاوان اتحادیوں نے تین کروڑ روپے اس سے حاصل کیے مزید اس کے دونوں شہزادوں کو یرغمال بنایا، ۱۷۹۲ر میں صلح ہوئی اور ۱۷۹۶ر میں شہزادے واپس ہوئے، سلطان ٹیپو نے انگریزی سامراج کی جارحیت کو روکنے کے لئے حیدرآباد، ترکی فرانس، اور افغانستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں سفارتیں بھیجیں، امداد کے لئے آمادہ کرنا چاہا مگر افغانستان کے علاوہ کسی نے بھی ظلم کے خلاف قدم نہیں اٹھایا، افغانستان مدد کے لئے فوجیں روانہ کیا تو انگریزوں کے ہوش اڑ گئے سامنے اپنی موت نظر آنے لگی فورا ایران اپنے سفیر کو بھیج کر شاہ ایران سے افغانستان پر حملہ کروادیا نتیجتاً والی افغانستان زمان شاہ راستے ہی سے واپسی پر مجبور ہو گیا۔　(مستفاد تحریک آزادی اور مسلمان فیصل ندوی بھٹکلی)

اب انگریز کو یقین ہو چکا تھا کہ باہر سے امداد ممکن نہیں ہے اس لیے ۱۷۹۹ء میں جنرل ہیرس کی کمان میں انگریزی فوج بغیر کسی مزاحمت کے سرنگا پٹم پہونچ گئی نظام حیدرآباد کی فوج اور مرہٹوں کا لشکر بھی ساتھ میں تھا، اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے امرا بھی خوشگوار مستقبل کی امید میں انگریزی فوج میں شامل تھے۔

سلطان ٹیپو نے ہمت نہیں ہاری اور امراء کے کہنے کے باوجود صلح پر کسی طرح آمادہ نہ ہوا، گھوڑے پر سوار کر میدان جنگ میں نکلا، ادھر میر صادق نے انگریزوں کو خبر بھیج کر دوسری

طرف سے قلعہ میں داخل کرا دیا، سلطان ٹیپو آخر تک بے جگری سے لڑتا رہا اور اپنے ہی امرا میر صادق وقاسم کی غداری کے باعث شہادت سے سرفراز ہو گیا۔ لارڈ ولزلی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر کو لکھا کہ،، ٹیپو کی موت اور اس کی سلطنت کا خاتمہ دیگر ہندوستانی حکمرانوں کے لئے ایک ایسا سبق ہے کہ وہ آئیندہ ہمارے خلاف کچھ کرنے کی جرأت نہ کرسکیں گے۔

(سلطنت خداداد: ص: ۳۵۰)

ٹیپو سلطان کے ساتھ جہاد حریت میں سیکڑوں علما ومشائخ شریک تھے، درس وتدریس میں مشغول علماء کے علاوہ سجادہ نشینوں تک میدان جہاد میں شریک ہو گئے، تاریخ کے اوراق میں جن کے نام محفوظ ہیں ان میں مولانا سعید محمد خان، محمد باقر علی خان، مولوی میر حبیب اللہ، حضرت سید باچھا، حضرت سید شاہ فریدالدین شہید، حضرت سید مصطفیٰ شہید، حضرت ابراہیم شطاری، حضرت محب اللہ شاہ قادری، مولوی غازی خان، حسین علی کرمانی، قاضی عمر شہید نائطی، مولوی محمد محی الدین نائطی، مولانا محمد علی، مولوی محمد صبغۃ اللہ نائطی، مولوی حسن علی سعید نائطی، مولوی محمد حمزہ طاہر شافعی، شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی، شاہ ابواللیث رائے بریلوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ (جنگ آزادی میں علماء کا کردار: ص)

تحریک سید احمد شہید:

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایک انگریز افسر نے کہا تھا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے،، اور یہ امر واقعہ ہے کہ پورا ملک پر عملی اعتبار سے انگریزی سامراج ہی کا سکہ جاری تھا، اور مجاہد آزادی مولانا حسین احمد مدنی کے بقول،، ۱۸۰۳ء میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے نے بادشاہ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ جابرانہ طریقہ پر لکھوا کر ملک میں اعلان کرا دیا کہ،، خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا،، تو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا فتویٰ دیا اور مسلمانوں کو آزادی ہند کے لئے آمادہ کرنا ضروری سمجھا۔ (نقش دوام: جلد دوم: صفحہ: ۴)

ہندوستان میں شاہ صاحب کے فتویٰ دارالحرب کے بعد دیگر علاقوں کے متعدد علماء ہند

نے بھی اس ملک کو دارالحرب قرار دیا، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حریت کے خاکے میں رنگ بھرنے کی منصوبہ بندی بھی کی اور اپنے شاگردوں، مریدوں اور دوسرے معتمد متعلقین کو جہاد آزادی کے لئے آمادہ کیا جہاد کے لیے ایک منظم لشکر کی ترتیب دی اپنے قابل اعتماد مرید سید احمد شہید کو اس کا امیر بنایا۔

سید احمد شہید کی امارت میں اس جماعت نے ایک طرف ظلم وتشدد کے عادی سکھوں کا ناطقہ بند کیا تو دوسری طرف انگریزوں کو بھی ناکوں چنے چبوائے، اس تحریک میں پورے ملک کے جید علما کی قیادت میں مسلمان مجاہدین شریک تھے، سید صاحب اوران کے دست راست شاہ اسماعیل شہید نے صوبہ سرحد کے پہاڑی علاقوں کو جہاد کا مرکز بنایا، اور یہیں سے منظم انداز میں جہاد آزادی شروع کی، اور متعدد بار سکھوں کو شکست وریخت سے دوچار کیا، سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید صاحب کی شہادت کے بعد ان کے مرید مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور عنایت علی عظیم آبادی نے اس محاذ کو سنبھالا، اور پھر انگریزوں کے خلاف مسلسل نبرد آزما رہے یہی وہ تحریک ہے تاریخ میں جسے تحریک بالاکوٹ کا نام دیا گیا، اس تحریک کا امتیاز ہے کہ ۱۸۰۳ر سے شروع ہوئی تو ڈیڑھ صدی تک مسلسل اس کی سرگرمیاں جاری رہیں، اس جماعت کو فنا کرنے کے لئے انگریزوں نے پوری طاقت جھونک دی مگر اس کے بے تاب شراروں کو کسی بھی طرح سے وہ بجھا نہیں سکے یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ رونما ہوا، اور اس کے بعد بھی تحریک ولی اللہی کی سرگرمیوں کو روکا نہیں جاسکا تاریخ ہند کا یہ صفحہ شاہد ہے،، بغاوت کی آگ بجھا دی گئی مگر تحریک ولی اللہی کی مشعل فروزاں ہی رہی اس کے سرغنہ سرحد سے برابر انگریزوں پر حملے کرتے رہے ایک انگریز جو وہابی کیس میں انکوائری کے لئے مقرر کیا گیا تحقیق کے بعد کہتا ہے کہ:

> ”گو پٹنہ کے مولویوں نے ۱۸۵۷ء میں کوئی نمایاں رول ادا نہیں کیا ان کے ذہن میں کچھ اور پلان تھے، انہیں ستانا (سرحد) کے وہابیوں کی طرف سے دعوت دی گئی تھی وہ سرحد آ کر انگریزوں کے خلاف جہاد کریں، چنانچہ سرحد پر روپیہ پورے ملک سے برابر فراہم کئے جارہے

تھے جس کی وجہ سے برطانوی حکومت نے مختلف مرکزوں کو تباہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا''۔

(ہارڈی:ص:۸۲: P:82Hardy بحوالہ تاریخ ہند:ص:۸۳)

ہر پرشاد چٹو پادھیا کی تحقیق کے مطابق،، وہابیوں کے عقائد اوران کی رہنمائی کا بھی مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف کھڑا کردینے میں بڑا حصہ رہا ہے اس خفیہ تنظیم کے ایجنٹ جگہ جگہ مقرر تھے انہیں باضابطہ تنخواہیں دی جاتی تھیں،، ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''یہ تحریک برطانوی اقتدار کے لیے سب سے زیادہ زبردست چیلنج تھی سیداحمد شہید کی تحریک نے مسلمانوں میں آزادی وطن کی تمناؤں کو دوام بخشا اوران مولویوں نے انگریزوں کے خلاف تمام تحریکوں کو بھرپور تعاون دیا یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو''۔

(تاریخ ہند تاراچند بحوالہ تاریخ جنگ آزادی: ۱۸۵۷، مصنف: خورشید مصطفیٰ رضوی:ص: ۸۴)

۱۸۵۷ء کے بعد اس تحریک کے ممبران کو چن چن کر گرفتار کیا گیا سزائے موت دی گئی، تختہ دار پر چڑھادیا، بے شمار رہنماؤں کو جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا، جہاں سیکڑوں مجاہدین گھٹ گھٹ کر شہید ہوگئے تحریک کے سرگرم رکن مولانا جعفر تھانیسری کسی طرح بچ کر واپس آئے، اس حوالے سے انہیں کی کتاب کالا پانی پڑھنے کے لائق ہے جسے اردو میں پہلی خود نوشت کا درجہ حاصل ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت:

ہندوستان کی اس ملک گیر بغاوت میں جہاں میرٹھ کی افواج نے انگریزی سامراج کے خلاف اعلان بغاوت کیا وہیں دہلی میں بے شمار علماء نے بھی اس جنگ میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ قائدانہ رول بھی ادا کیا، یہی وجہ تھی کہ انگریزوں کی فتح کے بعد سب سے زیادہ ظلم علماء اسلام ہی پر کیا گیا، ٹامسن ایڈورڈ کی رپورٹ اس سلسلے میں واضح شہادت ہے جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ دہلی میں کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس میں علما کے اجسام لٹکے ہوئے نہ ہوں، لاہور کی شاہی مسجد میں ایک اک دن اسی اسی علماء کو پھانسی دے دی گئی۔ جلتے ہوئے شعلوں میں انہیں جھونک دیا گیا۔

علماء دیوبند کی سرگرمیاں:

عین جنگ کے وقت ضلع مظفرنگر کے شاملی میدان میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجرمکی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی قیادت میں علمائے دیوبند نے برطانوی سامراج کے خلاف معرکہ آرائی کی، سرفروشانہ انداز میں ان سے جنگ کی، اس جنگ میں حافظ ضامن رحمت اللہ علیہ شہید ہوئے، منصوبہ یہ تھا کہ یہاں دشمنوں کا صفایا کر کے دہلی کی بغاوت کو کامیابی کی منزل سے ہم کنار کیا جائے مگر شاملی کی معرکہ آرائی ابھی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا جس کی وجہ سے یہاں پر منطقی طور پر اس کے اثرات ظاہر ہوئے اور انگریز فاتح رہا، ان مجاہدین کے خلاف بھی بغاوت کی فرد جرم عائد کی گئی انہیں حوالہ زنداں کیا گیا۔

مولانا احمد اللہ مدراسی کی قائدانہ جنگی معرکے:

بغاوت ہند سے ایک سال قبل ہی فقیرانہ صورت میں مولانا احمد اللہ صاحب اودھ کے علاقے میں داخل ہوئے اور اپنی روحانی مجلسوں کے ساتھ ساتھ جہاد آزادی کے لئے ایک پوری فوج تیار کر دی، اور لکھنؤ میں آزادی کے شراروں کو نہ صرف شعلوں میں تبدیل کیا بلکہ اپنی جماعت کے ساتھ بیگم حضرت محل کے شانہ بشانہ انگریزی افواج سے متعدد جنگیں کیں، اور کئی محاذوں پر ایسی بے جگری سے لڑے کہ انگریزوں کے لئے راہ فرار کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا، لکھنؤ کے سقوط کے بعد ان کی سرگرمیاں فیض آباد کے علاقے میں جاری رہیں، یہاں بھی ان کی بہادری اور شجاعت کے چرچوں سے فضا گونج رہی تھی، دوبارہ لکھنؤ آئے تو پھر اپنے مجاہدین کے ساتھ برسرپیکار ہوئے، ان کی مسلسل سرگرمیوں اور فداکارانہ اقدام کی وجہ سے ساورکر مؤرخ نے لکھا ہے،، ہر شخص کو اس سب سے بڑے ہیرو کے آگے سر جھکا لینا چاہیے جو مٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ پھر لکھنؤ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے (ایضا) مولانا احمد اللہ کے ایک ساتھی پیر ظہور علی نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ لکھنؤ کی شکست کے وقت عیش باغ میں مع دو ہزار ساتھیوں کے تھے یہاں سے موسی باغ گئے اور تمام دن جنگ ہوئی شام کو شہر خانقاہ میں

گیے جنگ اگلے دن بھی ہوئی اوراسی دن وہ باڑی روانہ ہو گئے۔

(فریڈم اسٹرگل: جلد دوم: بحوالہ تاریخ آزادی، خورشید مصطفیٰ: ص:۴۸۶)

تحریک ریشمی رومال:

۱۹۱۲ء میں دارالعلوم دیوبند ہی کے فرزند ارجمند حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے عالمی پیمانے پرانگریزی انخلاء کے لئے زبردست مہم چلائی، اورآزادی ہند کے لئے افغانستان میں آزادحکومت قائم کی، اس غرض کے لیے مولانا عبیداللہ سندھی کوافغانستان روانہ کیا، اورخود مکہ مکرمہ گئے خلافت اسلامیہ کے گورنر غالب پاشا کے ذریعے خلیفہ عثمانی سے رابطہ کیا تاکہ اس کی اعانت اورافغانستان کے ذریعے منظم طور پرانگریزی حکومت پر حملے کر کے یہاں سے نکال دیا جائے، مگر قیام مکہ کے زمانے میں عبیداللہ سندھی کی رپورٹ جوانھوں نے مکہ ارسال کی تھی ایک شخص کے ہاتھ لگ گئی جو انگریزوں کا وفادار تھا، جس کی وجہ یہ راز فاش ہوگیا ہوگیا، شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، وغیرہ کو جزیرہ مالٹا بھیج دیا گیا، اور وہاں تین سال تک قید بامشقت رکھا گیا۔

جمعیت علمائے ہند کا قیام:

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی قیادت میں رونما ہونے والی تحریک خلافت جس میں مسلم رہنماؤں نے گاندھی جی کے ساتھ دوسرے برادران وطن کو متحد کر کے حریت کی تحریک کو مضبوط و مستحکم کیا، اور ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ملک گیر ہنگامی دورہ کیا، اپنی انقلابی تقریروں اورنعروں سے شہروں سے جھونپڑیوں تک کی فضاؤں میں آزادی کی روح پھونکی اسی پلیٹ فارم سے علماء وقت نے ۱۹۱۹ء ہی میں جمعیت علمائے ہند کی بنیاد رکھی اس تحریک کے سرگرم کارکن اور رہنما شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا ابوالمحاسن سجاد، مولانا ابوالکلام آزاد مولانا سعید احمد دہلوی تھے، جنھوں نے اپنی دیوانہ وار سرگرمیوں کے ذریعے پورے ملک میں حریت کی آگ لگادی۔

کراچی لاہور، کلکتہ سے لیکر دہلی تک کے اجلاس میں علی الاعلان کانگریس کے برخلاف

انگریزوں کے انخلاء اور انگریزی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا، برٹش گورنمنٹ کی نوکریوں اور ان کے سامانوں کو ترک کردیا گیا، جس کی پاداش میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے رہنماؤں نے زندگی کے اکثر حصے جیل کی سلاخوں میں گذار دیئے، حمد آباد، مرزاپور، رانچی اور ملک کی دوسرے قید خانے سالہا سال ان کے وجود سے آباد رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی اس خارزار اور ہلاکت خیز شاہراہ پر صدیوں تک مسلمانوں نے تنہا سفر کیا ہے، بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب آزادی کی منزل قریب آئی، ظلم وجبر کی خوفناک تاریکیوں میں سحر کے آثار نمودار ہوئے، تب دوسری اقوام نے اس میدان میں قدم رکھا، مسلمانوں کی قربانیوں اور ان کی سرفروشانہ سرگرمیوں کی روشنی میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اگر اس قوم کی قربانیاں استخلاص وطن کے لیے نہ ہوتیں تو یہ ملک کبھی آزاد نہ ہوتا اور برطانوی سامراج سکون واطمینان سے حکومت واقتدار کے ذریعے سفاکیت کی تاریخ رقم کرتا رہتا، یہ مسلم مجاہدین ہی تھے جو ہر مرحلے اور ہر محاذ پر ان کی راہوں میں چٹان بن کر کھڑے رہے اور ان کی منصوبہ بندیوں کو اپنی جان ومال اور عہدہ ومنصب کو قربان کرکے زیروزبر کیا۔

اس کے باوجود یہ کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ مسلمانوں کی قربانیوں کو حکومتی سطح پر حرف غلط کی طرح مٹادیا دیا گیا، نصابوں میں تاریخ سازی کرکے ان کے سنہرے کردار پر عصبیت کا پردہ ڈال دیا گیا، اور انہیں مجاہدین آزادی جنھوں نے ملک پر اپنی ایک اک متاع نثار کرکے جمہوری ملک کا خواب دیکھا تھا انہیں کی نسلوں کو ہر طرح سے خوف ودہشت میں مبتلا کیا گیا، اور ہزاروں افراد کو مختلف حربوں سے نہ صرف قید خانوں کے حوالے کیا گیا بلکہ اس سرزمین سے مسلمانوں کے انخلاء کی بھی منظم تدبیریں عمل میں لائی جانے لگیں، دنیا میں احسان فراموشی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں لیکن اس قدر گھناؤنی اور انسانیت سوز مثال شاید ہی روئے زمین کے کسی خطے میں موجود ہو کہ اقتدار کے نشہ میں وطن کے لیے قربانیاں دینے والے پروانہ حریت کی قوم کے ساتھ فرقہ وارانہ روش اختیار کی گئی ہو اور پوری طاقت وقوت سے اس کی مذہبی، معاشرتی، تمدنی آزادی کو پابہ زنجیر کیا گیا ہو اور اس کے اقتصادی سرمایہ پر مسلسل حملہ کیا گیا ہو۔

نام اور کام

مفتی شکیل منصور القاسمی

نام سے انسان کی صرف شناخت ہی نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس سے "ذی نام" کے رخ، رجحان،، وجدان، ذہن، فکر، مزاج اور طبیعت کی غمازی اور عکاسی بھی ہوتی ہے۔عربی کا مشہور مقولہ ہے "کل اناء یترشح بما فیه" (جس برتن میں جو چیز ہوتی ہے اس سے وہی چیز ٹپکتی ہے) نام اور شخصیت کے مابین وہی ہم آہنگی، گہرا تعلق اور دائمی وابستگی ہے جو جسم اور روح کے درمیان پائی جاتی ہے۔"اگر ایک طرف نام سے ذات کی غمازی ہوتی ہے تو دوسری جانب شخصیت اور ظاہری شکل وصورت سے بھی نام کا اندازہ لگ جاتا ہے۔(جیسا کہ ہم نیچے تحریر کریں گے) اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح جسم کے اچھے اور برے اعمال وحرکات سے روحِ انسانی میں "ملکیت یا بہیمیت" پیدا ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح نام کے حسن وعمدگی سے روح میں لطافت و بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔انسانی افکار واعمال کی تعمیر ہوتی ہے اور جذبہ عمل کو تقویت ملتی ہے۔ اور نام کے قبح سے روح میں کثافت، انسانی اعمال میں آلودگی اور پراگندگی پیدا ہوتی ہے۔

نام کا اثر کام پر:

حق سبحانہ وتعالیٰ نے "عبدالعزّیٰ" کی کنیت "ابولہب" رکھی، عاقبت، انجام اور آخرت کے لحاظ سے یہ نام (کنیت) کتنی مسلّمہ حقیقت کی ترجمانی کررہا ہے!۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے "ابوالحکم بن ہشام" کی کنیت "ابوجہل" رکھی، تو اس کی شخصیت پہ یہ کنیت کتنی فِٹ ہوئی، اور اس کے افکار واعمال پر اس لفظ کے کتنے گہرے اور ان مٹ نقوش چھائے رہے! اور اہل علم کے علم میں یقینا یہ ہوگا کہ حق و باطل کی سب سے پہلی فیصلہ کن لڑائی "غزوۂ بدر" میں مشرکینِ عرب کو نہتے

مسلمانوں سے جو شرمناک اور بدترین شکست ہوئی، اس کی منجملہ وجوہ کے ایک اہم اور حقیقی وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کی طرف سے جو سب سے پہلے مقابلہ کے لیے میدانِ کارزار میں اترے، ان میں "ولید" "شیبہ" اور "عتبہ" نامی تین آدمی تھے۔ ولید کے معنی میں کس قدر ضعف و عجز کا پہلو ہے؟ (پیدائش کے وقت بیحد ناتواں اور کمزور بچہ کو کہتے ہیں) اور "شیبہ" تو بڑھاپے کی اس حد کو کہتے ہی ہیں جب انسان کے تمام اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں اور قویٰ معطل ہو جائیں! اور "عتبہ" میں جو عتاب وعذاب اور قہر وغضبِ خداوندی کا "جہانِ معانی" نہاں ہے، وہ "جہاں" میں کسی سے قابل بیان نہیں! غور کیجیے! جن "برتنوں" سے ضعف و کمزوری، عجز و ناتوانی اور قہر عتاب "جھلکتے" ہوں؟ کیا ان سے قوت و جوانمردی، دلیری و بہادری اور فتح و نصرت "چھلک" سکتے ہیں؟۔

ادھر مسلمانوں کی طرف سے جو حضرات ان کے مقابلہ کے لیے آئے تھے ان میں ایک نام "علی" کا تھا، جو سراپا "علو" سے عبارت تھا، دوسرا نام "عبیدہ" کا تھا، جن سے "عبدیت وبندگی" ٹپکتی تھی (اللہ کے نزدیک یہ سب سے پیاری صفت ہے، اسی لیے جو نام "عبد" سے شروع ہو وہ اللہ کے یہاں بہت پسندیدہ شمار ہوتا ہے) اور تیسرا نام "حمزہ" کا تھا جو اپنے "جلو" میں شیر کی صلابت رکھے ہوئے تھا، تو علی کے "علو"، عبیدہ کی "عبودیت" اور حمزہ کی "قوت صلابت" نے ان کی شخصیتوں کو ایسا متأثر کیا اور نام کی عمدگی سے ان کے کام پہ ایسا اثر مرتب ہوا کہ بے سروسامانی کے عالم میں ایک مسلح اور ہتھیار بند فوج کو صرف چند گھنٹوں میں مولی گاجر کی طرح صاف کر دیا۔

تاریخِ اسلام کے اس تابناک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ "نام" سے "کام" کتنا متأثر ہوتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، انسان، حیوان، شہر، آبادی اور مکان غرض کہ ہر چیز میں اچھے ناموں کو پسند فرماتے تھے اور برے ناموں کو سن کر آپ کے دل پر تکدر کی چوٹ لگتی تھی، اور ان تمام چیزوں کے پیچھے یہی غرض مقصود ہوتی تھی کہ اچھے نام پر اچھے نتائج مرتب ہوں گے، اور برے ناموں پر بُرے۔ چنانچہ روایتوں میں آیا ہے کہ:

(١) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دودھاری اونٹنی کے دودھ نکالنے کے لیے چندلوگوں کو

بلایا، ایک ”مرّہ“ (کرواہٹ) نامی آدمی اس کے لیے کھڑا ہوا، لیکن چوں کہ اس کے نام سے کسی ”شیریں“ نتیجہ کا حصول مشکل تھا، اس لیے آپ نے نام سے نتیجہ کا استنباط فرماتے ہوئے اس کو بٹھا دیا، دوسرا شخص کھڑا ہوا، اس کا نام بھی حرب (جنگ وجدال) تھا، اس نام سے بھی کسی مثبت نتیجہ کی امید فضول تھی، اس لیے آپ نے اس کو بھی کہا بیٹھ جاؤ۔ تیسرا شخص کھڑا ہوا، جس کا نام تھا ”یعیش“ (زندگی) چوں کہ اس نام سے زندگی اور حیات جیسے امید افزاء معانی سمجھ میں آرہے تھے، اس لیے آپ نے اس کو دوہنے کی اجازت دی۔

(۲) ایک غزوہ سے واپسی پر آپ دو پہاڑوں کے درمیان سے گذر رہے تھے۔ آپ نے دونوں پہاڑوں کے نام دریافت کیے پتہ چلا کہ ایک کا نام ”فاضح“ اور دوسرے کا نام ”مخز“ (ذلیل ورسوا کرنے والا) ہے۔ چوں کہ ان دونوں ہم معنی ناموں سے نامسعود نتیجہ کی عکاسی ہورہی تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ راستہ فوراً بدل دیا۔

(۳) صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سہیل بن عمرو آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان کے نام سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ فرمایا کہ ”ان شاء اللہ مشرکین مکہ کے ساتھ جاری ہماری مصالحتی کوشش بھی ”سہل“ رہے گی اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا“۔ (زادالمعاد ۲/۴)

نام سے کام اور انجام کس قدر متأثر ہوتا ہے؟ اس کی مزید وضاحت کے لیے موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت انتہائی ”چشم کشا“ اور ”بصیرت افروز“ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے ایک شخص کا نام پوچھا، اس نے کہا: جمرۃ (چنگاری) باپ کا نام پوچھا، تو کہا: شہاب (بھڑکتی ہوئی آگ) کہا کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو؟ تو کہا ”حُرقۃ“ (جلن، سوزش) سے، کہا گھر کہاں ہے؟ تو کہا: حرۃ النار (آتشیں محلہ) پھر پوچھا کہ تمہاری رہائش کہاں ہے؟ کہا: ذات لظی (آگ سے دہکتی ہوئی جگہ) جب اس شخص کے تمام ہی ناموں میں ”آتشیں مادہ“ ہی کارفرما تھا، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا: کہ تمہارا گھر ”آتش زنی“ سے نہیں بچ سکتا ہے“۔ چنانچہ نام کا اثر ظاہر ہوا، اور وہ شخص جب گھر لوٹا تو دیکھا

کہ واقعتا اس کا گھر جل چکا تھا۔

یہ واضح ہوگیا کہ نام سے ذی نام کی شناخت ہوتی ہے، لیکن دونوں کے درمیان اتنا مستحکم رشتہ ہے کہ ذات و شخصیت سے بھی نام کا پتہ چل جاتا ہے۔ چنانچہ ایاس بن معاویہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ محض شکل وصورت اور عادات واطوار دیکھ کر یہ بتادیتے تھے کہ اس شخص کا نام کیا ہے؟ اور حیرت یہ کہ اس میں کبھی غلطی بھی نہیں ہوتی تھی۔

الغرض شخصیت سازی، اور اخلاق واعمال کی تعمیر میں "نام" اہم اور بنیادی رول ادا کرتا ہے اس لیے معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کو اسرار حیات سمجھانے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اور پسندیدہ نام رکھنے کی تعلیم فرمائی اور ہمیں اس طرح "راز حیات" سمجھا گئے "تم قیامت میں اپنے اور باپوں کے نام سے پکارے جاؤ گے اس لیے تم اپنا نام اچھا رکھا کرو" یعنی نگاہِ نبوت میں یہ طبعی حقیقت جلوہ گر تھی کہ نام کا اثر کام پر ضروری ہے، تو جب نام اچھا ہوگا تو امتی کے اعمال بھی اچھے ہوں گے اور جب اعمال اور کام سنور جائیں گے تو روزِ قیامت اچھے اوصاف والقاب سے انہیں پکارا جائے گا۔ تحسین اسماء کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم محض سرسری نوعیت کی نہیں تھی، اور نہ ہی صرف وعظ وتلقین کی رسمی حدوں تک محدود تھی! بلکہ آپ نے امت کو اپنے متعدد عملی نمونے بھی دیئے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے بہتیرے صحابہ و صحابیات کے نامناسب نام ازخود بدلے ہیں۔ مثلاً حضرت عاصیہ کا نام بدل کر آپ نے جمیلہ رکھا، اور حضرت برّہ کا نام بدل کر جویریہ رکھا، حضرت اصرم کا نام بدل کر زرعہ، ابوالحکم کا نام بدلکر ابوشریح رکھا۔ اسی طرح آپ نے حضرت عاص، عزیز، عقلہ، شیطان، غراب، حکم، حباب اور شہاب وغیرہ کے نام بھی تبدیل فرمائے تھے۔

(جاری)

❀❀❀❀❀

قسط اول:

’بھیرا‘ کا شعری منظر نامہ

محمد عرفات اعجاز اعظمی

سرزمین بھیرا [مئو، اتر پردیش] کو علم و عمل کے ساتھ شعر و ادب میں بھی نمایاں مقام حاصل رہا ہے، اس گاؤں کے افراد ہر زمانہ میں شعر و ادب کے شایق اور پرورشِ لوح و قلم کے دل دادہ رہے ہیں۔ ہندستان کی تقسیم سے قبل اور اس کے بعد بھی یہاں کی محفلیں علم و فن کے ذکر اور شعر و ادب کے زمزموں سے پُرشور رہی ہیں۔ طرحی مشاعروں کا انعقاد اور نعتیہ محفلوں کا قیام بالکل عام سی بات تھی جو مہینے دو مہینے پر برپا ہوتی رہتی تھیں، جس میں مقامی شعرا کے علاوہ اطراف کے اصحابِ شعر و ادب بھی شریک ہوتے تھے۔ ہر شاعر کی ایک انجمن ہوتی تھی جس میں خوش گلو نوجوان شامل ہوتے تھے، جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ اطراف میں یا کہیں بھی کوئی نعتیہ یا غزلیہ مقابلہ منعقد ہوتا تو وہ اپنی انجمن کے سرپرست شاعر کا مصرعِ طرح پر لکھا کلام لے کر جاتے اور مقابلہ میں شرکت کرتے۔ اس طرح کے مقابلوں میں عموماً دو باتوں کے پیش نظر کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہوتا: اولاً کلام کی عمدگی اور ثانیاً پڑھنے والوں کی خوش الحانی۔

بھیرا اور اس کے اطراف کے گاؤں میں شعر و شاعری کا چرچا اس معنی میں زیادہ رہا ہے بلکہ اب بھی ہے کہ یہاں کوئی بھی اجتماعی دینی کام شعر و شاعری کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً کسی مسجد کی تعمیر کے لیے یا کسی اور دینی کام کے لیے اگر چندہ کی ضرورت ہوتی تو بجائے گھر گھر جا کر رقم یک جا کرنے کے تاریخ وار گاؤں کے سارے محلے میں مغرب تا عشا نعتیہ مشاعرہ کا اعلان کر دیا جاتا اور اس کے لیے باقاعدہ گاؤں کے ایک یا دو شاعر نعت اور جذبۂ ایثار کو ابھارنے والے اشعار لکھ کر اس میں شرکت کرتے۔ اس سے اصل مقصد بھی حاصل

ہوجاتا اور گاؤں کے باذوق افراد کی ذہنی و ادبی تربیت کا سامان بھی ہوجاتا۔ اس طرح کے مشاعروں کے بعض اشعار ایسے ہوتے کہ گاؤں میں زبان زد خاص و عام ہوجاتے اور موقع بموقع ہر کہ ومہ کی نوکِ زبان پر ہوتے۔

بھیرا کی سرزمین سے بہت سے شاعر پیدا ہوئے اور دادِ سخن دی، مگر ان کے شعر وادب کا شہرہ فصیل بھیرا اور قرب و جوار کے مواضعات سے آگے نہ بڑھ سکا، جب کہ ان میں کئی صاحبِ دیوان تھے۔ ان میں ایک مولوی محمد عثمان فدائی فاروقی صاحب [۱۸۶۰ء-۱۹۱۹ء] جن کے فارسی واردو اشعار کا مجموعہ ان کے صاحب زادے (وکیل) سلمان صاحب نے ان کی وفات کے بعد ۱۹۳۴ء میں 'فدائی' کے نام سے شائع کیا، دوسرے جناب قاضی محمد شعیب کوثر [۱۹۲۵ء-۲۰۰۸ء] ہیں جن کے نعتیہ کلام کا مجموعہ 'ذکر حبیب' کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا، اور تیسرے جناب عبدالسمیع فدا [۱۹۴۱ء-۲۰۱۷ء] ہیں، جن کے کلام کے چھوٹے بڑے سات کتابچے شائع ہوئے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: ۱-ارضِ مقدس، ۲-باغِ طیبہ، ۳-غنچہ و گل، ۴-نغمہ گداز، ۵-جلوۂ رنگیں، ۶-دیارِ حبیب ۷-بہارِ مدینہ۔

بھیرا کے شعری افق کو اپنے فن کی روشنی سے منور کرنے والے اور اس کی فضاؤں میں دادِ سخن دینے والے چند قابل ذکر شعرا کے نام یہ ہیں:

۱- مولوی عثمان فدائی فاروقی [۱۸۶۰ء-۱۹۱۹ء]
۲- الحاج قاضی محمد شعیب کوثر اعظمی [۱۹۲۵ء-۲۰۰۸ء]
۳- جناب عبدالحفیظ نجمی [۱۹۲۷ء-۱۹۸۷ء]
۴- جناب عبدالسمیع فدا [۱۹۴۱ء-۲۰۱۷ء]
۵- جناب نورالہدیٰ قمر [۱۹۴۵ء-۲۰۱۴ء]
۶- الحاج بشیر احمد بشیر [ولادت: ۱۹۳۲ء]
۷- مولانا عبدالحلیم نوری [۱۹۴۶ء ۲۰۱۷ء]
۸- ماسٹر محبوب بھیروی [ولادت: ۱۹۴۸ء]

۹- جناب اسرار احمد قریشی [ولادت: ۱۹۷۶ء]

۱۰- مولانا محمد ابوالوفا رضوی [ولادت: ۱۹۷۶ء]

مولوی محمد عثمان فدائی:

مولوی محمد عثمان فدائی صاحب شیخ ابوسعید بن شیخ معروف ثانی کی اولاد میں سے ہیں، ان کے والد کا نام شاہ خادم علی تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کامیاب وکیل تھے، مگر بعد میں وکالت ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

مولوی محمد عثمان صاحب کی ولادت بھیرا میں ۱۸۶۰ء-۱۲۷۶ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم غازی پور میں مولوی عبداللہ سب جج و رئیس غازی پور کے زیر سایہ ہوئی۔ درس نظامی کی ابتدائی کتابیں مولوی حفیظ اللہ صاحب فتح پوری سے پڑھیں۔ قانون کی تعلیم مولوی عابد حسین صاحب سے حاصل کی اور کامیاب وکیل کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔

مولوی محمد عثمان فدائی صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ جون پور میں گزرا، آخر عمر میں جون پور سے باہر ظفر آباد ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بنگلہ میں رہائش اختیار کر لی تھی اور وہیں ۱۳/ دسمبر ۱۹۱۹ء کو وفات پائی۔ [شاہ محمد سلمان، فدائی، ۱۹۳۴ء، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں: ص ۱ تا ۶]

مولوی محمد عثمان صاحب کامیاب وکیل ہونے کے ساتھ بہترین شاعر بھی تھے، ان کو فارسی اور اردو زبان پر یکساں مہارت تھی اور دونوں زبان میں داد سخن دیتے تھے۔ تخلص فدائی تھا۔ ان کی وفات کے پندرہ سال بعد ان کے بیٹے اور سر شاہ سلیمان [۱۸۸۶ء-۱۹۴۱ء] کے برادر خرد (وکیل) شاہ سلمان صاحب نے ان کے فارسی اور اردو کلام کو 'فدائی' کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شایع کیا۔ اس کا مقدمہ علامہ کیفی چریا کوٹی [۱۸۹۰ء - ۱۹۵۲ء] نے لکھا ہے۔ 'فدائی' کی طباعت بدایوں کے مشہور مطبع 'نظامی' میں ہوئی ہے۔

فدائی اصلاً غزل کے شاعر تھے، اردو و فارسی دونوں زبانوں میں انھوں نے صنفِ غزل ہی میں زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں زبان کی شیرینی، مضمون آفرینی،

محاکات وتلمیحات، شورش وسرمستی، رندی و پاک دامنی اور تعلیم اخلاق کے ساتھ اساتذۂ قدیم کے کلام پر تضمین بھی ملتی ہے۔ ان کے چند فارسی و اردو کے اشعار بطور نمونہ یہاں درج کیے جاتے ہیں:

بہ آب زندگانی تا نہ می خواہی وضو کردن
نمازِ عشق نتواں کرد بر سجادۂ دلہا

اس شعر کے طرز بیان اور مضمون آفرینی کا جواب نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب تک زندگانی کے پانی سے وضو نہ کرلیں اس وقت تک دل کے مصلے پر نمازِ عشق ادا کرنا درست نہیں ہے۔ 'نماز عشق' کی مناسبت سے 'سجادۂ دلہا' اور 'وضو' کی مناسبت سے 'آبِ زندگانی' کے استعارے کی شگفتگی وسلاست اپنی جگہ ہے، لیکن اس سے جو مضمون پیدا کیا ہے وہ مضمون آفرینی کا شاہ کار ہے۔ یعنی جس طرح نماز کی روح خشوع وخضوع میں ہے اور اس کی صحت کے لیے وضو اور سجادے کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح نمازِ عشق یعنی کامل معرفت کی نماز ادا کرنے کے لیے اس حد تک خشوع ہونا چاہیے کہ وضو کے لیے آبِ زندگی نچوڑنے میں تکلف نہ ہو، اور دل کو مثل سجادہ دراز کرکے نمازِ عشق ادا کرے تو اس کا حق ادا ہوگا۔ یعنی معشوقِ حقیقی کے سامنے اپنی جان ودل سے بالکل بے پروا ہو جائے۔

زندگی کی ایک مسلم حقیقت جس کے تجربے سے ہر فرد بشر گزرتا ہے، جس کو قرآن نے 'ان مع **العسر** یسرا' سے بیان کیا ہے، اس کو انتہائی سادہ اور دل کش انداز میں اپنے شعر میں سموتے ہوئے کہتے ہیں:

مصیبت در پس ہر راحت ہست
کجا باشد گلے از خار فارغ

ہر راحت کسی نہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہے، یہی قانونِ فطرت ہے، اس کا عام سا مشاہدہ پھول کی شاخ میں ہوتا ہے کہ ہر پھول کے پہلو بہ پہلو کانٹا بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد مشاہدۂ کائنات سے نکل کر مشاہدۂ عرفان کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں:

ندارم صورتے جز دوست در دل
منم از منت اغیار فارغ

میں دوست کی تصویر کے سوا اپنے دل میں کچھ نہیں رکھتا، میں غیروں کے احسان سے فارغ و یکسو ہوں۔

فارسی زبان میں فدائی کے پسندیدہ شعرا حافظ، جامی اور حزیں وغیرہ تھے، اپنی غزلوں میں انھوں نے مذکورہ شعرا کی پیروی زیادہ کی ہے۔ فدائی کی متعدد فارسی غزلیں ان شعرا کی زمین میں ملتی ہیں، جس سے ان کی اثر پذیری اور کامیاب تتبع کا اندازہ ہوتا ہے۔

بقول کیفی چریا کوٹی ''حضرت فدائی حقیقتاً فارسی کے شاعر ہیں، لیکن اردو میں ان کا رنگ امتیاز کے ساتھ علاحدہ ہے۔'' فارسی میں انھوں نے کسی سے تلمذ کا تعلق نہیں رکھا مگر اردو میں آسیؔ غازی پوری مرحوم [۱۲۵۰ھ ۱۳۳۵ھ] کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے اور ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ [شاہ محمد سلمان، فدائی، ۱۹۳۴ء، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں: ص ۸۳] یہی وجہ ہے کہ استاذ کے مزاج وکلام کا اثر فدائی صاحب کے کلام پر بھی بڑا گہرا نظر آتا ہے۔ حضرت آسی کی متصوفانہ شاعری سب سے ممتاز تھی، اس کی جھلک فدائی صاحب کے کلام میں بھی نظر آتی ہے:

اس اپنی فقیری میں نہ کچھ مال نہ زر ہے
تھا اک دلِ آگاہ وہ اللہ کا گھر ہے

ٹوٹا نہیں تارِ زندگانی ❁ اللہ رے زورِ ناتوانی
میرے لیے وعدۂ نظارہ ❁ موسیٰ کے لیے خطابِ لن ترانی

چھوٹی بحر میں حضرت فدائی نے جو نشتر چبھوئے ہیں وہ خواجہ میر درد [۱۷۲۱ء ۱۷۸۵ء] کے نشتر کی یاد دلا دیتے ہیں:

جینا آزار ہوگیا ہے ❁ مرنا دشوار ہوگیا ہے
جو داغ وفا تھا دل میں روشن ❁ وہ شمع مزار ہوگیا ہے
سرمایہ نشہ جوانی ❁ پیری میں خمار ہوگیا ہے
کچھ ٹھیک نہیں دل و جگر ❁ جب سے غم یار ہوگیا
جوانی گئی زندگانی گئی ❁ وہ قصہ چکا وہ کہانی گئی
مجھی تک تھا سب شکوہ زند گی ❁ نہیں میں تو سب بدگمانی گئی

عبدالحفیظ نجمی:

بھیرا کے شعری منظر نامے میں ایک قابل ذکر و اعتنا نام عبدالحفیظ نجمی صاحب کا ہے۔ نجمی صاحب نے اپنے شعر گوئی کے سفر میں کن کن اصناف سخن کو اپنی موزونیِ طبع کا میدان بنایا، اس کا ہمیں علم نہیں ہوسکا۔ ان کا کلام دست برد زمانہ سے محفوظ بھی نہیں رہ سکا، تلاش بسیار کے بعد ان کے پوتے مولانا محفوظ احمد بھیروی صاحب نے ان کے چند مراثی فراہم کیے ہیں۔ بطور نمونہ ایک نوحہ کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

جن کے لبوں کا بوسہ لیتے تھے آپ اکثر ❁ پانی نہیں وہ پائے سرکار کربلا میں
جس کا اے میرے آقا دل آپ نے نہ توڑا ❁ اس پہ اٹھی ہزاروں تلوار کربلا میں
بائیس ہزار فوجیں دشمن بنی ہوئی ہیں ❁ کوئی نہیں ہے حامی غم خوار کربلا میں

عبدالسمیع فدا:

ماضی قریب کے شعرا میں ایک اہم نام عبدالسمیع فدا صاحب کا ہے۔ یہ اصلاً نعت اور غزل کے شاعر ہیں۔ بڑی عمدہ نعتیں اور غزلیں لکھی ہیں، یکسو اور گوشہ نشیں انسان تھے، شہرت اور اسبابِ شہرت سے خود کو بچائے رکھا، اس لیے ان کا اور ان کے فکر وفن کا شہرہ زیادہ دور تک نہیں پھیل سکا اور واقعہ یہ ہے کہ استحقاق سے بھی بہت کم ان کی پذیرائی وقدردانی ہوئی۔ ان کے کلام کا زیادہ حصہ ان کی زیر سرپرستی چلنے والی انجمن کے افراد نے پڑھا ہے۔ چوں کہ یہ انجمنیں مقامی ہوتی ہیں، اس لیے ان کا کلام ایک محدود حلقے میں گشت کر کے رہ گیا۔

گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں ان کا کلام رسائل وجرائد میں بھی شایع ہوتا تھا۔ ماہنامہ 'حیات نو' [اجرا:۱۹۵۸ء] وارانسی (بنارس)، ماہنامہ 'حرمین' [اجرا:۱۹۵۶ء] مرادآباد اور 'مومن' بدایوں کے کئی شماروں میں ان کا اور جناب شعیب کوثر اعظمی کا کلام میری نظر سے گذرا ہے۔

فدا صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ ان کے ورثہ کے پاس موجود ہے، اگر ذرا حوصلے سے کام لیا جائے تو اسے شایع کر کے محفوظ کیا جا سکتا ہے، ورنہ مرور ایام کے ساتھ دیگر بہت سے

شعرا کی طرح ان کے نام و کلام کا نقش بھی لوحِ جہاں سے مٹ جائے گا۔ان کے چند غزلیہ اشعار بطور نمونہ یہاں درج کیے جاتے ہیں:

طاقتِ دید نہیں خود ہی نظر میں ورنہ ❁ وہ ہر اک بزم میں ظاہر بھی ہے مستور بھی ہے
بادب دل کا طواف اس لیے میں کرتا ہوں ❁ کہ یہ کعبہ بھی ہے جلوہ بھی ہے طور بھی ہے
لوگ واقف بھی فدآ سے ہیں نہیں واقف بھی ❁ پوچھیے سچ تو یہ گم نام بھی مشہور بھی ہے
مفہوم بس اتنا میں رحمت کا سمجھتا ہوں ❁ مل جائے جو قطرہ بھی دریا میں تو دریا ہے
کافی ہے بس اتنی ہی تفصیل ہر اک گل کی ❁ مہکے تو گلستاں ہے مرجھائے تو صحرا ہے
کیا تیرے تصور کا عالم ہے ارے توبہ ❁ ہوتا ہے گماں جیسے میں نے تجھے دیکھا ہے
یوں محو عبادت ہوں اتنا بھی نہیں ہوش اف ❁ ہے کعبہ کو ہر سجدہ یا کعبہ میں سجدا ہے

فدا صاحب نے ابتدا میں جناب مشتاق احمد شیدائی خیرآبادی سے مشورہ سخن کیا،اس کے بعد ابر احسنی [۱۸۹۸ء-۱۹۷۳ء] کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ان کے بعض اشعار میں بھی ابر احسنی کا ذکر ملتا ہے۔ابر احسنی کے کی وفات [۱۹۷۳ء] پر کہا کہ:

پوشیدہ ہے شاعر کے تخیل میں جو پرواز ❁ بجلی کے مقدر میں وہ رفتار کہاں ہے
ہر بزم میں ہوتا ہے فدآ ابر کا چرچا ❁ شہرت ہے مگر ہستیِ فن کار کہاں ہے

ماسٹر محبوب:

ماسٹر محبوب صاحب فطری اور وہبی شاعر ہیں،ان کی طبیعت تقریباً ہر صنف سخن: حمد، نعت،غزل،نظم،مثنوی،رباعی،مرثیہ،قصیدہ،ہجو اور سہرا وغیرہ میں رواں ہے۔مشکل سے مشکل بحر میں انھوں نے دادِ سخن دی ہے،صنائع و بدائع میں ممتاز ہی نہیں،فایق ہیں۔ممکن ہے ان کا فکری سرمایہ بہت بلند نہ ہو،مگر وہ فن کی پوری پاس داری کرتے ہیں، بلکہ اس کی باریکیوں کا بھی لحاظ کرتے ہیں۔

محبوب صاحب نے اپنی زندگی ملازمت میں بسر کی،مشاعرے یا میدانِ ادب کی طرف توجہ نہیں دی، ورنہ ان کی مشاقی و مہارت کی ایک دنیا اسیر اور ان کے فن کا ایک جہاں گرویدہ ہوتا۔اگر وہ اپنا مجموعہ کلام شایع کریں تو مختلف اصناف سخن کے بہتر سے بہتر نمونے

سامنے آئیں گے۔اللہ کرے کوئی باحوصلہ اٹھے اوران کے فن پاروں کوضایع ہونے سے پہلے شایع کرکے محفوظ کردے۔مختلف اصناف سخن کے نمونے درج ذیل ہیں:

حمد

حمد تیری میں کروں مجھ میں یہ طاقت کہاں ❁ حکم سے تیرے خدا پیدا ہوئے دونوں جہاں
خالقِ کُل ہے تو ہی قادرِ مطلق تو ہی ❁ ذرے ذرے سے تری آج بھی قدرت عیاں
لالہ و گل سے کیا تونے مزین یہ چمن ❁ قلبِ صحرا سے کیا آب کا چشمہ رواں

نعت

یہ ہماری خوش نصیبی جونہیں تو اور کیا ہے ❁ کہ ہم امتی ہیں اس کے جو خدا کا ہے دُلارا
سرِ عرش خود خدا نے دیا ان کو نام احمد ❁ یہ ہے میم کا وہ پردہ جو ہے راز کن فکاں را
کرے ابر سایہ جن پر پڑھیں جن کا کلمہ کنکر ❁ وہ جو کردیں اک اشارہ تو قمر کا دل ہو پارا

غزل

یہ انتہاے عشق نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ❁ ہر شے میں چشم قیس کو لیلیٰ دکھائی دے
دنیا میں آدمی کی ہے فطرت الگ الگ ❁ بد کو برا تو اچھوں کو اچھا دکھائی دے
اف ہاے تشنگی کہ بیاباں میں بھی سراب ❁ پیاسوں کو ٹھاٹھیں مارتا دریا دکھائی دے
محبوبؔ لکھتے آپ کچھ اس ڈھنگ سے غزل ❁ قطرے میں بحر کوزے میں دریا دکھائی دے

❁❁❁❁❁

امید کی ایک کرن

شرف الدین عظیم الاعظمی

زندگی کے الجھے راستے میں جب انسان چلتے چلتے تھک جاتا ہے۔ پاؤں جواب دے جاتے ہیں، اردگرد کا ماحول اجنبی سا لگنے لگتا ہے۔ دو وقت کی روٹی کے لئے چکی کی مشقت کا تسلسل جسموں کو بے جان کر دیتا ہے۔ مصائب و آلام کی بدلیاں زمانے کی نیرنگیاں۔ لمحات کی گردشیں۔ زندگی کے گلشن پر بے رحم خزاں بن کر آتی ہیں اور بہار آفریں چمن کی فضاؤں کو لہولہو کر جاتی ہیں۔ وجود کے تمام حصے جب اداسیوں کی گہری تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ تو۔ اس حوصلہ شکن لمحۂ جانگداز میں ــــ مایوسیوں کے اس خوفناک عالم میں ــــــــ ایک ــــ امید ــــ سحر کی۔ امید ــــ کہکشاں کے ٹوٹے ہوئے تارے کی مانند آتی ہے ــــ اور دل کے تاریک صحرا کو یوں روشن کر جاتی ہے کہ اردگرد کی دنیا بھی اس کی وجہ سے روشن ہو جاتی ہے ــــ جیسے دریا کی بے رحم موجوں کے تھپیڑوں کے درمیان موت سے نبرد آزما وجود کو تنکے کا سہارا مل جائے، یا جیسے تپتے ھوے صحرائے بے کنار میں موت کے سمندر میں ڈوبتی ہوئی زندگی کے سامنے ابر کا ایک ٹکڑا آجائے، اور چند قطرے اسے بخش دے۔

یہ امید ــــ زندگی کے راستے میں امنگوں ــــ ولولوں ــــ اور۔ حوصلوں۔ کے دیئے جلاتی ہے ــــ نیم جاں وجود میں حیات تازہ کی لہر پیدا کرتی ہے ــــ وہ تاریک بیاباں میں ایک حقیر جگنو کی طرح نمودار ہوتی ہے اور بے کیف اور تھکی ہوئی آنکھوں میں راستے کی معرفت کی چمک دے جاتی ہے ــــ سفر کی تیز گامی کی قوت فراہم کر جاتی ہے ــــ استقلال واستقامت کی روح سے آشنا کراتی ہے۔

اور پھر ــــــــ وقت کا ستایا ہوا۔ گردش دوراں کا مارا ہوا بے جان وجود ایک نئی روح ــــ ایک ولولہ تازہ کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے اس سفر کا ــــ جس میں منزلوں سے دور کر دینے والی مایوسیوں کا گذر نہیں، قدموں میں ارتعاش پیدا کرنے والی تاریکیوں کی جس میں

گنجائش نہیں۔۔ جہاں آشیانوں کونشانہ بنانے والی بجلیوں کی قوتیں عاجز اور بے بس ہوجایا کرتی ہیں۔ جہاں تھکن سے چور چورا جسام کو ہمت افزائیوں کے مرہم سے محروم کرنے کا ماحول نہیں۔ یہ امید ہی کا کرشمہ ہوتا ہے کہ نصب العین کی راہ میں عزم جواں ہمہ وقت ہمسفر اور جذبہ بیکراں کا کارواں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ انسانی زندگی میں۔ امید۔ کا دیا نہ ہو تو وقت سے پہلے انسان زندہ لاش بن جائے۔ زندگی بے کیف ہوجائے، اس کی حیات کا ہرا بھرا گلشن کبھی بہاروں سے آشنا نہ ہو پائے ـــــ زوال کے بعد از سر نو زندگی کی تعمیر کے لئے منزل عروج کے راستوں کا علم ـــــ زندہ قومیں ''امید'' ہی کے روزن سے حاصل کرتی ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مولانا عبداللہ قاسمی کے والد محترم جوار رحمت میں

آج بتاریخ ۶/اگست ۲۰۲۱ء بروز جمعہ رفیق محترم مولانا عبداللہ صاحب کٹولوی کے والد ماجد جناب ابوالکلام صاحب انتقال فرما گئے اس خبر وحشت اثر نے دل کی دنیا میں سوگواری کی کیفیت پیدا کر دی، طبیعت افسردہ ہوکر رہ گئی، قلب وروح کی کائنات میں بے کیفی سی چھا گئی۔ مرحوم نہایت نیک، صالح، عبادت گذار اور متقی تھے، وہ بے ضرر اور فیض رساں انسان تھے، انتہائی خلیق، ملنسار، متواضع اور وسیع الظرف انسان تھے، نماز وتلاوت کا بہت اہتمام تھا، اذان سے پہلے ہمیشہ مسجد پہونچتے، اذان دیتے، مسجد کی صفائی کرتے، اور انتظامی امور کے تمام معاملات کی دیکھ ریکھ کرتے، اس کی ضروریات پر اپنی طرف سے رقمیں بھی خرچ کرتے،

پوری زندگی انھوں نے کسب معاش کی راہ میں مشقتوں میں گذاری، لیکن زندگی کی دشواریوں کا کبھی شکوہ نہیں کیا، ہر حال میں صابر وشاکر رہتے، طویل عرصے سے کسب معاش ہی کے سلسلے میں خلیج میں مقیم تھے، چند ماہ سے گھر ہی پر تھے، اور بالکل صحت مند تھے، عید الاضحیٰ کے موقع پر انہیں جسم میں درد کی شکایت ہوئی، ڈاکٹر ارشد صاحب کی دوا سے وہ درد رفع ہو گیا، مگر اندر سے مکمل طور پر مرض کا ازالہ نہ ہوسکا اور پھر نوبت ہاسپٹل تک پہونچی، جونپور کے سنیتا ہاسپٹل میں پندرہ روز تک ایڈمٹ رہے، مگر وقت موعود آچکا تھا اور بے قرار روح اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہوگئی۔

رمضان المبارک کے اخیر عشرے میں شریک حیات یعنی مولانا عبداللہ صاحب کی والدہ بھی آخرت کو سدھار گئی تھیں، شاید اسی فرقت کے صدمے نے بہت جلد مرحوم کو بھی دائمی سفر پر روانہ کر دیا۔ اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کی خدمات کا اپنی شان کے مطابق بدلہ عنایت فرمائے مولانا عبداللہ صاحب اور دیگر خانہ کو صبر وجمیل وشکیبائی عطا فرمائے، غم کی اس نازک گھڑی میں ادارہ الماس خلوصِ دل کے ساتھ اظہار تعزیت پیش کرتا ہے۔ شریک غم۔ شرف الدین عظیم قاسمی

عورت کا کرداراوراقبال کا نظریہ فکر

خواجہ کوثر حیات صاحبہ

تمام عالم میں برصغیر کے عالمگیر شہرت یافتہ عظیم شاعر وفلسفی، مفکر، مصلح قوم، اُخوت کے پیکراور دانائے قوم ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کوان کی ادبی وعلمی بے لوث خدمات کی وجہ سے خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ یوں تو علامہ کی شہرت اور مقبولیت اردو اور فارسی زبانوں میں بہت زیادہ ہے۔مگر اقبال نے جو رنگ،لب ولہجہ اردو زباں کو بخشا وہ منفرد اور مثالی ہے۔اقبال نے اپنے کلام میں جا بجاء مسلمانوں کو اپنا ماضی یاد دلایا ہے۔

بقول اقبال:

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

ان کا ماننا تھا کوئی بھی قوم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنے اسلاف کی تاریخ سے واقف نہیں ہوتی اور اپنے اسلاف کے ہدایات پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔اقبال کی شاعری روح کو جھنجھوڑنے والی، ضمیر کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والی ہے۔خلاصہ یہ کہ ان کے فلسفہ میں ایک درس اور پیغام ہوتا ہے۔ان کے کلام میں مایوسی اور ناامیدی کو بیداری میں تبدیل کرنا اور قوم میں اعلیٰ اقدار پیدا کرنا رہا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانوں کی تربیت اور خودشناسی کا اہتمام کیا۔

عورت کے حوالے سے جو تصورات علامہ اقبال کے کلام میں ہیں وہ پہلے کسی اور شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہیں۔انہوں نے دیگر شعراء کی طرح عورت کے خدوخال اور ظاہری

خوبصورتی کے بجائے عورت کے پاکیزہ وصف کو اس طرح پیش کیا کہ جس کی بدولت غزل ونظم کو نئی بنیاد ملی جو آج بھی ایک نظیر ہے۔

عورت پر اقبال کی شاعری صرف غزل کا شعار نہیں بلکہ ان کی نظر اور کلام میں عورت قابل تکریم ہستی ہے۔ چاہے وہ ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے روپ میں ہوں۔ عورت کو رب کائنات نے جو عظمت عطا کی وہ ہر اس کردار میں اپنا ایثار، قربانی، محبت، شفقت اور بے لوث خدمات کا پیکر ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال نے عورت کی ان خوبیوں اور اوصاف کو مختلف مثالوں کے ذریعہ اپنی نظموں میں ڈھالا ہے۔

تاریخ اسلامی اگر دیکھیں تو ایسی عظیم خواتین کی مثالیں موجود ہیں جو تمام امت کی خواتین کے لیے رہبری کی عمدہ رہنما اصول ثابت ہوگی۔ علامہ اقبال نے جہاں بیٹی کی تربیت کا ذکر کیا وہیں بیٹی کی تعلیم کی بھی ترغیب دی ہے۔ مگر ساتھ ہی جدیدیت کے حاوی ہوتے غلبہ سے بچنے اور محفوظ رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ انہیں یہ فکر ہر لمحہ لاحق رہتی کے جدید تعلیم عورت کو اس کے مقصد حقیقی سے دور نہ کردے۔ اپنے اشعار کے ذریعہ وہ درس دیتے ہیں کہ دینی تعلیم زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ عورت کی بنیاد دین کے عالمگیر اصولوں پر ہونی چاہئے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت ✿ ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن ✿ ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

اقبال ”جاوید نامہ“ میں ایک مثالی بیٹی شرف النساء بیگم کا ذکر کرتے ہیں جو نواب خان بہادر خان کی بیٹی اور پنجاب کے گورنر نواب عبدالصمد خان کی پوتی تھیں۔ جو اپنا بیشتر وقت تلاوت قرآن پاک میں صرف کرتیں اور اس دوران ایک مرصع تلوار ہمیشہ ان کے ہمراہ رہتی کم سنی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کی یہ نصیحت تھی کہ ان کی قبر اسی مقام تلاوت پر بنائی جائے اور قرآن اور ان کی تلوار کو ان کی قبر کے تعویذ پر رکھا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کا عورت سے متعلق وہی نظریہ ہے جو اسلامی تعلیمات کے متعلق ہے۔ وہ عورتوں کے لیے وہی طرز زندگی پسند کرتے ہیں جو اسلام کے ابتداء سے مروج ہے۔

ڈاکٹر علامہ اقبال بہن کے رشتہ کے وجود کی اہمیت کو فاطمہ بنت خطاب خلیفہ دوم حضرت عمرؓ فاروق کی بہن کے مضبوط کردار کے ذریعہ اجاگر کیا ہے۔ اس میں علامہ اقبال اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جب حضرت عمرؓ نے اسلام قبول نہیں کیا جبکہ ان کی بہن اور بہنوئی دونوں نے اسلام قبول کرلیا تھا جب بحالت غیض وغصہ عمر بن خطابؓ بہن کے گھر جاتے ہیں اور فاطمہ بنت خطاب کی قرآن کی تلاوت کے الفاظ حضرت عمرؓ کے کانوں پر پڑتے ہیں اور ان ہی الفاظ کی تاثیر حضرت عمرؓ کے دل پر ثبت ہوتی ہے۔ اسے سن کر وہ جونعوذ باللہ آپ ﷺ کو قتل کا ارادہ کررہے تھے وہ ترک کر کے آپ ﷺ کے پاس جاکر کلمہ پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے ہیں۔ ایک بہن کے مضبوط کردار نے انہیں ہ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اس واقعہ کو اپنے کلام میں پیش کر کے علامہ اقبال نے عورت کی عظمت اس کے کردار کی مضبوطی کو پیش کیا ہے۔ جس نے یہاں رہبر اور رہنما کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ کلام کے ذریعہ یہ بات پیش کرتے ہیں۔

''تو جانتی ہے کہ تیری قرأت کے سوز نے عمر کی تقدیر بدل کر رکھ دی تھی''

اسی طرح علامہ اقبال اپنے کلام میں حضرت فاطمہؓ کی مثال پیش کرتے ہوئے بیوی کا بلند مقام وعظمت بیان کرتے ہیں۔ اس میں وہ حضرت فاطمہؓ کی حضرت علیؓ کے تئیں وفا شعاری اور توکل کا خوبصورتی سے ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح وہ نہایت سادہ اور مشقت بھری زندگی بسر کررہی تھیں۔ رحمۃ اللعالمین نبیؐ آخری الزماں کی بیٹی شوہر کے گھر اپنے ہاتھ سے کام کرتیں اور جو تسلیم ورضا کا پیکر تھیں، ساتھ ہی وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتیں۔

اپنے اشعار کے ذریعہ علامہ اقبال عظیم بیٹی کا کردار رو برو کرواتے ہیں۔ ان کی فرمانبرداری اور دین پر ثابت قدمی جو بے شک آج کی ہر عورت کے لئے قابل تقلید ہے پیش کرتے ہیں۔

نوری اور آتشی اس کے فرمانبرداری ہیں ❁ شوہر کی مرضی میں اس کی مرضی ہے
وہ جس کی پرورش صبر و رضا میں ہوئی ہے ❁ چکّی پیستے ہوئے بھی اس کے لبوں پر قرآن جاری ہے

سب سے اہم اور قوی کردار کی طرف آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے مثنوی رموز بے خودی میں ایک حدیث مبارکہ کو اس طرح بیان کیا ہے ۔

گفت آن مقصود و حرف کن فکان
زیر پائی امہات آمد جنان

ترجمہ: اس مقصود حرف کن فکان (حضرت محمد ﷺ) نے فرمایا کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے۔ رموز بے خودی میں علامہ اقبال کہتے ہیں:

"سیرت فرزندہا از امیات"

ترجمہ: اولاد کی اچھی سیرت ماں کی (تربیت) کی وجہ سے ہی ہے۔

عورت کو ماں کی صورت میں عظیم مرتبہ حاصل ہے صرف اس وجہ سے کہ ماں اپنی اولاد کی تعلیم اور تربیت دلجمعی سے کرتی ہیں۔ اقبال قوم کی ماؤں کے سامنے ماؤں کا وہ کردار پیش کرتے ہیں جو نیک سیرت فرزند قوم کو دیتی ہیں جو کہ قوم کی ترقی کے ضامن ثابت ہوتے ہیں۔ ماں بچہ کی پہلی درسگاہ ہے۔ احکام خداوندی اور نظام خداوندی کو اپنے کلام میں واقعات سے مزین کر کے خود اپنی کامیابی کی وجہ اپنی ماں کی تربیت بتاتے ہیں جو ان کے خاندان کی سربلندی کی وجہ بنی۔ ان کی والدہ نے ان پڑھ ہونے کے باوجود دیں اور دنیا دونوں اعتبار سے ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ وہ اپنی ماں کی ہمت افزائی کو زندگی کے مراحل میں مشکلات کا سامنا کرنے کی طاقت مانتے ہیں۔ بانگ درا میں وہ اپنی نظم "مرحومہ والدہ کی یاد میں" رقم طراز ہیں کہ:

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات ❁ تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
قطع تیری ہمت افزائی سے یہ منزل ہوئی ❁ میری کشتی بوس لب ساحل ہوئی

علامہ اقبال نے جا بجا تاریخ ساز خواتین کے کردار کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے جو آفرین ملت ہیں جو امت کے لیے مثال ہیں۔ ماں کے مقام اور عظمت کا ادراک اپنی ذاتی زندگی سے کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنی نظم جو کہ مرثیہ کی طرح ہے ماں کو سب کی ماں بنا دیا ہے۔ جگہ جگہ وہ اپنے نظریات اور فلسفہ کو اشاروں میں پیش کرتے ہیں۔ ہر چند کے امام بی بی

پڑھی لکھی نہیں تھیں اس کے باوجود علامہ اقبال کی تربیت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔

تقدیر کے مقابلے میں انسان کی بے بسی و بے چارگی کا نقش ابھرنا ایک قدرتی بات ہے۔اسی لیے نظم کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی ہے
پر وہ مجبوری وہ بے چارگی ہے

علامہ اقبال رب کائنات کے کارساز ہونے کا احساس دلاتے ہیں کہ ہر چیز قادر المطلق کے ہاتھ اور طئے شدہ ہیں۔آسماں، سورج، چاند سبھی اس ذات کے سامنے مجبور ہیں۔تیز رفتار ستارے بھی اللہ تبارک تعالی کے مرہون منت ہیں۔ہر ذی روح، جاندار، بے جان تمام کے تمام اللہ تعالی کے احکامات کی عمل آوری کررہے ہیں۔سورج کا غروب ہونا، چاند کا نکلنا، باغ میں کلیوں کا چٹک کر پھول بنناحتی کہ بلبل کے نغمہ سے لے کر ضمیر کی آواز تک اس مالک حقیقی کی دسترس میں ہے۔

علامہ اقبال اس نظم کے ذریعہ اللہ تعالی کی لازوال نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ماں کے گزر جانے کے صدمہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ”زندگی کا باغ ماں کے جانے سے ویران ہوگیا ہے۔ماں کی جدائی کا غم ایسا ہے کہ نہ خوشی کے موقع پر ہنس پاتا ہوں اور نہ غم کے وقت آنسو نکلتے ہیں۔انسان کتنا ہی صابر وشاکر کیوں نہ ہو زندگی کے کسی نہ کسی موقع پر اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ بے اختیار آنسو بہانے پر مجبور ہوجاتا ہے:

یہ تیری تصویر قاصد گریہ پیہم کی ہے
آہ یہ تردید میری حکمت محکم کی ہے

لیکن ماں کی تصویر، ان کا تصور علامہ اقبال کے آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے۔“ وہ کہتے ہیں کہ:

”میری حکمت دانائی سب دھرے رہ جاتے ہیں ماں کے غم کے سامنے۔“ ماں سے دوری کا غم درد کا ایسا عرفان ہے جس سے عقل کی رسائی ممکن نہیں۔اپنی نظم میں بڑی خوبصورتی سے ماں کا ذکر کرتے ہیں کہ ”مرحوم والدہ کی یاد انہیں حال و ماضی کا خوبصورت امتزاج دیتی ہے، ان کا بچپن یاد آجاتا ہے۔وہ ان لمحوں کو یاد کرتے ہیں جب ان کا جسم کمزور تھا اور وہ بولنے سے بھی قاصر تھے واحد

ماں وہ ہستی تھیں جوان کی طاقت بنتی اور بغیر بولے بھی ان کا مدعا سمجھ لیتی تھیں۔ وہ شکرگزار ہے کہ ماں کی توجہ اور تربیت کی بدولت ہی ان کی خوش گفتاری کے چرچے ہو رہے ہیں۔"

بے شک ماں دنیا کی واحد ہستی ہے جس کے سامنے عالی مرتبہ انسان اپنے آپ کو چھوٹا سا بچہ محسوس کرتا ہے۔ ماں کی محبت وشفقت ایک ایسا جذبہ ہے جس سے ہر عمر میں انسان سیراب ہونا چاہتا ہے۔ ماں کی آغوش ایسی جگہ ہے کہ اس کے سائے میں آ کر ساری تکالیف ذہن سے محو ہو جاتی ہے، مانو وہ ایک گمشدہ جنت ہے۔

جب انسان اگر وطن سے دور بھی ہو تو ماں بے صبری سے خط کا انتظار کرتی ہیں۔ اپنی فریاد کے ذریعہ اقبال واضح کرتے ہیں کہ ماں آدھی رات کو اولاد کی بہتری کی دعائیں مانگتی ہیں۔ اور جب وہ اس دارفانی سے کوچ کر جائے تو کون ہوگا جو نصف شب کو اپنی اولاد کے لیے دعائیں مانگے گا۔

اقبال ماں کے اعلیٰ مقام کو کُل انسانیت کے سامنے اس طرح رکھتے ہیں کہ ماں کی زندگی دین و دنیا کے حوالے سے ایک سبق کی مانند تھی۔ زندگانی کی آب وتاب ماں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے مگر جب وہ اس قابل ہوتے کہ اپنی ماں کی خدمت کر سکیں والدہ نہیں رہی۔ ماں کی خدمت کا خواب ان کے دل میں ہی رہ گیا۔ وہ اس بات کا بھی ادراک کرتے ہیں کہ ان کی کمسنی کے دور میں ان کے بڑے بھائی نے ماں کی بہت خدمت کی۔ پھر ان کا غم کتنا زیادہ ہوگا وہ تو بلک بلک کر روتے ہیں۔ انہیں کیسے صبر آئے گا جب کہ مجھے ہی صبر نہیں آتا۔ وہ اپنی والدہ کے انتقال کے وقت یورپ میں تھے۔

"مرحوم والدہ کی یاد میں" اس نظم میں علامہ اقبال نے موت کی حقیقت کی منظر کشی کر کے دنیا کا مکروہ چہرہ ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا تو جوان، بوڑھے ہر ایک کے لیے ماتم کدہ ہے اور اگر زندگی اور موت کا مقابلہ کرنے جائے تو زندگی بے حد مشکل اور موت بہت آسان ہے۔ مگر موت وہ تلخ حقیقت ہے جو غریب کی جھونپڑی سے لے کر امراء کے دولت کدہ سے ہوتے ہوئے صحرا، آبادی، ویرانے غرض ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی اقبال ایک درس یہ بھی دیتے ہیں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے کہ اس کے خلاف نہ تو کوئی گلہ کر سکتا ہے اور نہ شکایت۔ وہ کہتے ہیں کہ موت کا کوئی

مداوا نہیں۔مگر مرنے والے کی جدائی کا غم وقت کے ساتھ کم ہوتا ہے مگر اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔اور کسی بھی تکلیف کے پہنچنے پر یہ غم آنسوؤں کی شکل میں بہنے لگتے ہیں۔

مکالمات افلاطون نہ لکھ سکی، لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

علامہ اقبال اسلامی طرز زندگی کے پیش نظر کہتے ہیں کہ شرعی حدود میں رہ کر عورتیں تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں۔وہ اپنے کلام میں فاطمہ بنت عبداللہ کا ذکر کرتے ہیں جو چودہ سالہ کم سن معصوم عرب لڑکی جسے انہوں نے شجاعت کی مثال کہا ہے جو جذبہ جہاد سے مالا مال تھیں۔ جنگ طرابلس میں غازی اور زخمی مجاہد بھائیوں کو اپنے مشکیزے سے پانی پلاتی ہوئی جام شہادت نوش کر گئی تھیں۔اس واقعہ سے علامہ اقبال بہت متاثر ہو کر نظم 'فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے' بانگ درا میں اس نظم کے ذریعہ اس واقعہ سے امت کو واقف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے ❁ ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی! تیری قسمت میں تھی ❁ غازیانِ دیں کی سقائی تیری قسمت میں تھی

علامہ اقبال کے تحریر کلام سے یہ عیاں ہے کہ وہ عورت کو بیٹی کے روپ میں معصومیت، شرم وحیا، زیور تعلیم سے آراستہ اور مغربی تہذیب سے پاک چاہتے ہیں۔بہن سے بہادری اور جرأت مندی کی توقع رکھتے ہیں۔بیوی کو صبر وتحمل، شوہر کی فرمانبردار اور وفا کا پیکر مانتے ہیں۔ ماں کو بہترین تربیت گاہ تصور کرتے ہیں جہاں اللہ کے صالح بندے، قوم کے معمار اور سماج کے بہترین شہری تیار ہوتے ہیں اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:ـ

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی میں سوزِ دروں

علامہ اقبال کے کلام کے باعث کئی اسلامی تاریخی واقعات ہمارے سامنے موجود ہے جو نوجوان نسل اور عورتوں کے لیے آج بھی رہنما ثابت ہو رہے ہیں۔آخر میں یہ ضرور کہوں گی کہ ادب کا یہ خورشید اپنی شاعری کی روشنی سے کل امت کو بصیرت دے گیا۔علامہ اقبال کی عہد ساز شخصیت پر اردو ادب جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔

طرحی غزل

نوشاد اشہر اعظمی بلریا گنج اعظم گڑھ

سنو پیام مرا انقلاب چاہتا ہوں ❁ ہو بوند بوند لہو آفتاب چاہتا ہوں
رگوں سے پھوٹ بہے وہ شباب چاہتا ہوں ❁ ہٹانا چہرۂ شب سے نقاب چاہتا ہوں
بس اک نصاب زمانے میں ہو محبت کا ❁ بدل دو وقت کے سارے نصاب چاہتا ہوں
کہاں ہے غیرتِ ملی تھا جس پہ ناز تمہیں ❁ ہر ایک شخص سے اس کا جواب چاہتا ہوں
فرازِ دار پہ چڑھ کر اذان دو یارو ❁ ہو سونے والوں میں کچھ اضطراب چاہتا ہوں
اب احتساب ضروری ہے حکمرانوں کا ❁ ''زمیں پہ بہتے لہو کا حساب چاہتا ہوں''
عدو کے سر پہ جو لہرائے برق کی مانند ❁ تمہاری تیغِ عمل میں وہ تاب چاہتا ہوں
اٹھو بدل دو نظامِ کہن ضروری ہے ❁ سنو پیام مرا انقلاب چاہتا ہوں

☆☆☆☆☆

غزل

کسی نگاہ سے لپٹا دھواں نہیں ہے کیا ❁ جلی ہوئی کوئی بستی یہاں نہیں ہے کیا
حصارِ ذات میں اپنے سمٹ گیا ہے کیوں ❁ تری نگاہ سے آگے جہاں نہیں ہے کیا
پکا ر تی ہے رہِ ابتلائے پر آشوب ❁ کسی کے سینے میں عزمِ جواں نہیں ہے کیا
جسے بھی دیکھئے آیا ہے دھوپ اوڑھے ہوئے ❁ کسی کے پاس یہاں سائباں نہیں ہے کیا
زمیں کو بیٹھے ہو زنجیرِ پا بنائے ہوئے ❁ اٹھاؤ اپنی نظر آسماں نہیں ہے کیا
مصلیانِ صداقت گھروں سے نکلے نہیں ❁ دیارِ کذب میں حکمِ اذاں نہیں ہے کیا
سکون کیسے تمہیں ہے چراغ گل کر کے ❁ حقیقتِ شبِ تیرہ عیاں نہیں ہے کیا
سراغ ڈھونڈ رہا ہے مری وفاؤں کا ❁ تری شناخت کا کوئی نشاں نہیں ہے کی
بھٹک رہے ہیں سبھی خواب در بدر اشہر ❁ کسی کا شہر میں اپنا مکاں نہیں ہے کیا

☆☆☆☆☆

تعارف کتب

شرف الدین عظیم اعظمی

نام کتاب: سرگذشت حیات

مصنف: مولانا ڈاکٹر ابواللیث صاحب

مرتب: مولانا ضیاء الحق خیرآبادی مئو یوپی

صفحات: ۲۵۶

ناشر: مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد مئو

قیمت: ۳۰۰

نثری ادب میں دیگر اصناف کے علاوہ خودنوشت یا آپ بیتی کی صنف بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے، یہ صنف جس قدر اہم ہے اتنی ہی مشکل ہے، کہ دوسروں کے احوال وکردار کی تصویر کشی کے مقابلے میں اپنی زندگی کے نشیب وفراز کو مکمل انصاف وصداقت کے ساتھ پیش کرنا اور زندگی کے تلخ وشیریں واقعات کو قلمبند کرنا کسی چیلنج سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ بشری تقاضوں کے زیر اثر عموماً تحفظ نفس کے جذبات کے تحت نیز اپنی ذات کی کمیوں، خامیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے سوانح نگار اس صنف میں حقیقت بیانی کی ہمت نہیں کر پاتا جس کی وجہ سے تخلیقی سرمایہ اعتدال کی راہ سے ہٹ کر بے کیف وبے اثر ہوجاتا ہے۔

ایک بہترین، اثر انگیز، نصیحت خیز اور لوگوں کے دلوں میں کچھ کر گذرنے کی ہمت اور جذبہ پیدا کرنے والی خودنوشت سوانح وہی ہے جس میں بے کم وکاست، اور بے تکلف زندگی کے نشیب وفراز، سرد وگرم حالات، اور زندگی کے داخلی تجربات واحساسات اور ذاتی کردار وعمل کی صورت گری کے علاوہ اردگرد کے سماجی، معاشرتی کردار کی منظر کشی بھی سلیقے سے کی گئی ہو، ڈاکٹر سید طفیل کے بقول "آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات و نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے، جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم وکاست قلم بند کردی ہو،

جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں۔" (اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت، ص: ۱۲۱)

زیرنظر کتاب سرگذشت حیات،، اپنی فنی، خصوصیات ذاتی زندگی سے متعلق حوصلہ افزا واقعات، قابل قدر اور ہمتوں کو قوت پرواز عطا کرنے والے خارجی تجربات، ومشاہدات اور باطنی محسوسات و کیفیات کی بے تکلفانہ انداز میں تصویر کشی کے حوالے سے خود نوشت سوانح نگاری کے باب میں گراں مایہ اضافہ ہے۔

خودنوشت سوانح یوں بھی زندگی کی تعمیر وتہذیب میں اہم کردار ادا کرتی ہے مگر تخلیق کا یہ سرمایہ کسی زبردست دانشور اور تاریخ ساز شخصیت کی طرف سے وجود میں آتا ہے تو اس کی افادیت، اہمیت اور نافعیت کی لو مزید تیز ہوجاتی ہے، زیرنظر کتاب ایسی شخصیت کی طرف سے لکھی گئی ہے جس کی علمی وفکری اور ادبی آوازے سے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم عالم اسلام کی علمی فضائیں پرشور ہیں، خصوصا ایک محدث اور محقق کی حیثیت سے عالمی سطح پر اسے اختصاص اور امتیاز حاصل ہے، علم وتحقیق کی دنیا میں اپنے شاندار کارناموں اور تاریخ ساز فتوحات کا نقش قائم کرنے والی وہ شخصیت مولانا ڈاکٹر ابواللیث صاحب خیرآبادی کی ہے جو سرزمین خیرآباد ضلع مئو اعظم گڈھ میں ایک گمنام گھرانے میں پیدا ہوئی اور اپنے عزم جواں، جذبۂ عمل، اور جہد مسلسل سے علم وتحقیق کی دنیا میں وہ بلند مقام حاصل کیا کہ اس کی طرف نگاہ اٹھانے میں اچھے اچھے بلند قامت ہستیوں کی ٹوپیاں زمین پر آ گئیں۔

مولانا محمد ابواللیث صاحب خیرآبادی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملیشیا میں پروفیسر ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس دانشگاہ کے اہم اور عظیم ترین منصب،، کرسی جمل اللیل للسنۃ،، کے چیر ہولڈر بھی ہیں، جو یونیورسٹی کا سب سے بڑا منصب اور عہدہ ہے۔ لیکن یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ بلندیوں کے اس وہفت آسماں تک رسائی یوں ہی آسانی کے ساتھ نہیں ہوئی ہے، عروج و ارتقاء کی یہ منزل بیٹھے بٹھائے نہیں حاصل ہوئی ہے؛ بلکہ اس کے پیچھے طویل قربانیوں کی ایک داستان چھپی ہوئی ہے، صبر آزما مراحل کی ایک دنیا پوشیدہ ہے، محنت

وریاضت، استقلال واستقامت اور ہدف کو پالینے کی فکر وتڑپ، خلوص ولگن اور شوق وجنون کی ایک کائنات وابستہ ہے۔

یہ کتاب قربانیوں اور سرگرمیوں کی اسی داستان کو بیان کرتی ہے، جد وجہد اور عزم وہمت اور شوق وجنون کی اسی روداد سے پردہ اٹھاتی ہے، اور حصول مقصد میں انہماک ودیوانگی کی اسی روح پرور اور عبرت خیز تاریخ کو بے نقاب کرتی ہے، اس کے علاوہ بھارت سے حجاز مقدس اور وہاں سے ملیشیا تک کے ثقافتی ماحول، تمدنی حالات، علمی وفکری، تہذیبی ومعاشرتی کوائف پر مشتمل اس عہد کی ہفت رنگ تصویروں سے بھی روشناس کراتی ہے۔

خیرآباد کے محدود ماحول سے دارالعلوم کی وسیع فضا کے درمیان کس طرح زندگی کے کارواں نے سفر طے کیا، پھر تدریسی خدمات کے دوران کیسی کیسی دشواریاں پیش آئیں، معاشی تنگیوں کی دھوپ میں کیونکر تعلیمی سفر جاری رکھا، اشاعت علم کی راہ میں فقر کی کیسی کیسی چٹانیں سدراہ ہوئیں، اپنوں کی بیگانگی کے باعث عزم وہمت کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں پر مایوسیوں کی کیسی برسات ہوئی، مایوسیوں کے اندھیروں میں پھر انہوں نے کس طرح سے عزم واستقلال کی قندیل فروزاں کی، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کی راہ میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں امتیازی پوزیشن کے باوجود کیسے کیسے صبرآزما مراحل آئے اور صحیح منہج اور سلف کے عقائد پر عمل کے دعویداروں نے عصبیت، وعداوت اور فرقہ پرستی وانتہاپسندی کے کیسے کیسے گل کھلائے، انصاف ودیانت کی عمارتوں پر کس بے رحمی سے شب خون مارا، اوران تعصب زدہ ماحول میں کس طرح کردار وعمل کی عظمت سے ہر مقام پر، ہر دانشگاہ میں اور ہرادارے میں مولانا خیرآبادی نے انفرادی شان اور امتیازی حیثیت حاصل کی، اس کے علاوہ عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد کس طرح ملیشیا یونیورسٹی کی راہیں ہموار ہوئیں، وہاں کس نوعیت کی خدمات رہیں طلباء پران کے کیسے اثرات مرتب ہوئے، علمی، تالیفی اور تحقیقی کارناموں میں کس شان کا کارنامہ مولانا نے انجام دیا ہے۔ سرگذشت حیات کے صفحات ان تمام پہلوؤں پر اور تمام گوشوں پر نہ صرف معلومات فراہم کرتے ہیں۔

بلکہ نصیحت خیز اور عبرت انگیز واقعات وحادثات کے تناظر میں حوصلوں اور امنگوں کی سوغات بھی عطا کرتے ہیں۔ یہ اوراق بتاتے ہیں کہ مولانا نے تعلیم کے تمام سرد وگرم مراحل میں ہدف کی طرف نگاہ رکھی، حالات کی سختیوں پر اشک ریزی کے بجائے آہ سحر گاہی کے ساتھ ساتھ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے سفر کو مسلسل جاری رکھا، ان کے خلاف نظریاتی تعصب کی بنیاد پر سازشوں کے طوفان آئے، نفرتوں کے سنگریزوں نے راستہ روکنا چاہا مگر صبر و استقلال کے ساتھ ان عناصر سے تعرض کئے بغیر آگے بڑھ گئے۔

پھر زمانے نے دیکھا کہ عصبیت کے زیر اثر اور بغض وحسد سے مغلوب سازشوں کا جال بننے والے تو محدود دائرے میں سمٹ کر رہ گئے، اور مولانا خیر آبادی کی اسلامی نظام، قرانی سسٹم اور احادیث مبارکہ کی تحقیقات کے موضوع پر بیسیوں تصنیفات کی شکل میں بیش بہا فتوحات نے علمی دنیا میں آپ کو آفتاب کی حیثیت عطا کردی، جس کی کرنوں سے عرب سے لیکر عجم تک روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب خاندانی ماحول، دوسرا باب تعلیمی روداد، تیسرا باب دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی مراحل سے متعلق ہے، چوتھا باب تدریس کے بارے میں ہے اس کے بعد پانچویں سے ساتویں باب تک مدینہ یونیورسٹی، ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کی دلچسپ، عزیمت واستقامت اور عزم وہمت سے معمور انگیز روداد ہے، آٹھویں باب سے چودھویں باب تک باستثناء نواں باب کہ یہ اولاد اور ان کی زندگی کے بارے میں ہے، ملیشیا یونیورسٹی میں تدریسی و تصنیفی اور تحقیقی خدمات جو عربی زبان میں ایک درجن سے زائد مستقل کتابیں، ۲۹؍ کی تعداد میں تحقیقی و تفصیلی مقالات کے علاوہ کتابوں پر تبصرے اور تقاریظ کی تفصیلات ہیں ان سے پردہ اٹھاتا ہے، پندرہویں باب میں حادثات وسانحات کا ذکر ہے اور سولہویں میں مصنف علام نے اپنے سفر کی روداد بیان کی ہے، اسی طرح سترہویں باب کو حضرت مولانا خیر آبادی نے اپنے تمام شیوخ واساتذہ سے مخصوص کیا ہے جس میں ابتدائی اساتذہ سے لیکر دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ام القریٰ تک کے پروفیسران شامل ہیں، آخری باب

میں اپنے دوست واحباب کے تذکرے کے علاوہ کتاب کے مرتب حضرت مولانا ضیاء الحق خیرآبادی جن کی کوششوں سے یہ کتاب وجود میں آئی ہے، ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور اسی باب میں مولانا کے ملیشیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے ان شاگردوں کا بھی ذکر جنھوں نے آپ کی ماتحتی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے ہیں خاص طور سے مولانا محمد شکیب نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف اور مولانا یاسر ندیم صاحب کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں موجود ہے۔۔اہم بات یہ ہے کہ حضرت مولانا ضیاءالحق خیرآبادی نے اپنے تحقیق آشنا قلم سے صاحب کتاب کی علمی وفکری بلندی اور ان کی زریں خدمات کے علاوہ خودنوشت سوانح کے تفصیلی پس منظر پر مشتمل ایک شاندار اور تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے جس کی وجہ کتاب کی وقعت و افادیت دوچند ہوگئی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ کتاب، علم وتحقیق کے ایک مسافر کے تجربات وواقعات پر مشتمل قیمتی معلومات، مصنف کی علمی وفکری عظمتوں، اور حدیث وقران کے متعلق ان کی لازوال خدمات کے ایک جہان سے جہاں اہل نظرکو روشناس کراتی ہے وہیں زبان وادب کے اعتبار اردو لٹریچر کی سوانحی صنف کو استحکام و وقار بھی عطا کرتی ہے، ۲۵۱ رصفحات پر محیط اس کتاب میں علم وادب کے مسافر کے لئے وہ تمام چیزیں مل جائیں گی جو لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں استقامت کی قوت اور بے جان اجسام میں ولولہ تازہ کا اثاثہ فراہم کرتی ہیں۔طباعت نہایت معیاری اور عمدہ ہے سرورق بھی خوبصورت اور کاغذ نفیس واعلی درجہ کا ہے۔

ملنے کا پتہ

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، مکتبۂ عکاظ دیوبند،

مکتبہ فہیم صدر چوک مئو یوپی،

مکتبہ احسان لکھنؤ،

ضیاء الکتب خیرآباد

سے یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔

نام کتاب: نقوش شبلی

مصنف: ڈاکٹر الیاس اعظمی رفیق اعزازی دارالمصنفین اعظم گڈھ

صفحات: ۳۱۹

ناشر: مصنف

مطبع: اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس دہلی۔

اسلامی دنیا کی عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیات میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) کی ذات علم وادب اور فضل وکمال کے اعتبار سے نمایاں حیثیت اور امتیازی شان کی حامل ہے، وہ اسلامی علوم وفنون پر مکمل عبور رکھنے والے متبحر عالم، ادیب وانشاء پرداز، بے مثال مؤرخ، زبردست مصنف ومحقق، شاعر ونقاد، ماہر تعلیم اور دانشور، اور سیرت نگار وسوانح نگار تھے، درحقیقت ان کی شخصیت کثیر الجہات اور عبقری تھی، ان کے متنوع کارناموں کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ان پر تحقیق وجستجو اور تحریر وتصنیف اور مطالعہ وتجزیہ کا دورانیہ ایک صدی پر محیط ہونے کے باوجود ہنوز اس کی بہت سی جہتیں پردہ خفا میں تھیں، اہل نقد ونظر اور اصحاب علم ودانش کی باریک بیں نظریں بھی ان پہلوؤں تک پہونچنے سے قاصر تھیں، یا انھوں نے مطالعات شبلی کے سفر میں ان جہتوں کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا، ادھر اکیسویں صدی کے آغاز میں شبلی شناسی کے افق پر ایک علمی وادبی شخصیت نمودار ہوئی اور اپنی حیرت انگیز تصنیفات، وتحقیقات اور جدید ونادر معلومات کے ذخیروں سے اس نے جہاں جہات شبلی کی نئی دریافت وبازیافت کی وسیع کائنات تعمیر کی وہیں اس نے اپنی تحریروں سے فکر اقبالیات وغالبیات کی طرح افکار شبلی وجہان شبلی کو مستقل موضوع کی حیثیت عطا کی ہے، علمی وادبی دنیا اس شخصیت کو ڈاکٹر الیاس اعظمی کے نام سے جانتی ہے۔

ڈاکٹر الیاس اعظمی صاحب کا تحقیقی شعور بہت بلند اور تخلیقی صلاحیت بہت اعلیٰ ہے، وہ اپنے تحقیقی عمل میں سطح پر تیرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ ذوق ومزاج کے مطابق وہ فکر وفن کے سمندر میں غواصی کرتے ہیں، اور معلومات کی گہرائیوں تک رسائی کی حتی الامکان کوشش کرتے

ہیں، اوران کے گراں مایہ تحقیقی سرمایہ کی روشنی میں یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ دشت تحقیق کے سفر میں نئی نئی فتوحات کی صورت میں مسلسل کامیابی نے نہ صرف انہیں امتیازی مقام عطا کیا ہے بلکہ مطالعات شبلی کے میدان میں انہیں جہان شبلی کا ترجمان ومحافظ اورامین کا بھی درجہ بھی عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر الیاس اعظمی صاحب نے مطالعات شبلی کو اپنی سرگرمیوں، جد وجہد اور تلاش وتفحص کو خاص موضوع بنایا ہے، اوراس حوالے سے انھوں نے کمیت وکیفیت ہر لحاظ سے اس قدر قیمتی اور عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں کہ علوم شبلی کی تشریح وبازیافت سے متعلق ان سے پہلے اس قدر وسیع پیمانے پر مطالعات شبلی کے حوالے سے کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

ہر چند علامہ شبلی کے جانشین سید صاحب نے حیات شبلی کی تصنیف اور مکاتیب شبلی کی تدوین کے ذریعے اس عبقری شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کواجاگر کرنے کی کوشش کی ہےاور ان کے بعد بھی ملک کے ادبی وتحقیقی رسائل وجرائد کے شبلی وافکار شبلی کے خاص نمبرات مثلاً معارف اعظم گڈھ، ماہنامہ خضر راہ، ماہنامہ ادیب علی گڈھ، شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڈھ سہ ماہی اسلام اور عصر جدید، سہ ماہی فکر ونظر، اورسہ ماہی اردو ادب وغیرہ کی گراں قدر معارف شبلی اورکمالات شبلی کی تشریح وتوضیح کا سلسلہ وقفے وقفے جاری رہا، اوران رسالوں کے ذریعے شبلی کی عبقریت کے بہت سے جلوے بھی سامنے آئے مگر باوجوداس کے جہان شبلی کے بہت سے اہم اور نادر گوشے اب بھی منظر عام پر آنے سے رہ گئے تھے، یا تھے تو نہایت اجمالی صورت میں، شبلی کی عظمت اور عظمتوں کے نقوش کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اس طرف توجہ کی جائے، اور انہیں روشنی میں لایا جائے، لیکن منظم اور مرتب انداز میں یہ عظیم الشان خدمت ڈاکٹر صاحب کے مقدر میں تھی۔

چنانچہ انھوں نے اپنے علمی سفر کا آغاز ہی اس جامع الکمالات اور نادر روزگار شخصیت کے اوصاف وکمالات اور خدمات وکارناموں کی کائنات سے کیا اور مطالعات شبلی کو اپنا خاص موضوع قرار دیا، تاہم اس راہ کے ابتدائی سفر میں وہ علامہ کے نئے گوشوں کی دریافت کے

ساتھ ساتھ دبستان شبلی کے دیگر آفتاب وماہتاب کے بھی علمی وفکری جلوؤں کو حیطہ تحریر میں لاتے رہے۔

لیکن ادھر تقریباً دو دہائیوں سے ان کی علم و تحقیق، تلاش وجستجو، اور تنقید وتخلیق کی ساری صلاحیتیں شبلی کی مختلف الجہات خدمات کی تحصیل ودریافت پر مرکوز ہوگئیں، نتیجتاً پورے تسلسل کے ساتھ مقالات ومضامین اور ضخیم تصانیف کی شکل میں اس تیزی سے جہان شبلی کی بازیافت ہوئی اوراس تواتر سے نئے نئے پہلوؤں کوانھوں نے اجاگر کیا کہ علمی وادبی دنیاورطہ حیرت میں پڑ گئی۔

زیرنظر کتاب ''نقوش شبلی'' اسی سلسلے کی ایک سنہری کڑی ہے، جس میں شبلی کی زندگی کے انہیں نقوش کواجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جواب تک لوگوں کی نگاہوں سے مستور تھے، تاہم ضمنی طور پر علامہ کے اوصاف وکمالات کی روشن جہتیں بھی نئے اسلوب اور جدید حیثیت کے ساتھ اس کتاب میں شامل ہوگئیں ہیں جس کی وجہ کتاب کی افادیت کا دائرہ وسیع تر ہوگیا، ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں شبلی کی عظمتوں کے تمام نقوش سے پردہ اٹھایا ہے، انھوں نے جہاں علامہ شبلی کی تاریخ نویسی، سیرت نگاری، شعروادب، فلسفہ وعلم کلام، تنقید نگاری اور مکتوب نگاری کا شاندار انداز میں تذکرہ کیا ہے، وہیں انہوں نے ان کی سیاسی، بصیرت، ملی خدمات، ذہانت وذکاوت وقوم وملت کی تڑپ، اور تعلیم وتربیت میں مہارت، ان کی بودوباش، ان کے ذوق ومزاج، اوراشاعت اسلام ودفاع اسلام پر بھی ان کی بےنظیر خدمات کی بہت خوبصورت اورمرتب انداز میں تفصیلات ذکر کی ہیں۔

یہ کتاب درحقیقت ڈاکٹر صاحب کے وہ مقالات جومختلف پروگراموں، اورسیمینار کے مواقع پر لکھے گئے تھے، ان کا مجموعہ ہے۔جن کی تعداد اٹھارہ ہیں اور تمام مضامین اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت قیمتی اورنادرونایاب معلومات سے مملو ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں کتابی شکل دے کر شبلی کے افکار وکمالات سے آگہی کی راہ ہموار کرنے کی اہم اورعلمی کوشش کی گئی ہے۔پہلا مقالہ علامہ شبلی کے بچپن اور تعلیم سے متعلق ہے جس میں کم سنی میں ان کی ذہانت

وفطانت، مطالعہ کی دلچسپی، اکتساب علم کی دھن، زبان وادب پر قدرت اور عربی ادب وحدیث کے حوالے سے ان کی تڑپ دھن اور مجاہدات کا ذکر ہے، مثلاً یہ واقعہ کہ جب انھوں نے فیض الحسن سہارنپوری کی خدمت میں تحصیل ادب کی غرض سے طویل سفر کر کے حاضری دی تو انھوں نے وقت کی تنگی کی بنیاد پر کہا کہ کالج جاتے ہوئے راستے میں مجھ سے پڑھ لو اور علامہ نے اسی طرح راستے میں عربی ادب پڑھی یہ واقعہ علم کے سلسلے میں آپ کی دیوانگی اور جنون کو بتاتا ہے۔

دوسرا مقالہ، علامہ شبلی کا علمی ادبی اور فکری سرمایہ، کے عنوان سے ہے، اس مقالے میں علامہ کی تاریخ نگاری، تنقید نگاری، سوانح نگاری، مکتوب نویسی، شعرو ادب میں ان کی حیثیت، فلسفہ وعلم کلام میں ان کی دسترس، پر عمدہ انداز سے بحث کی گئی ہے، علامہ شبلی نعمانی اور ان کے ہم عصر علماء ودانشوروں ڈپٹی نذیر احمد، علامہ اقبال، نواب محسن الملک سے کیسے تعلقات تھے، ان روابط کی نوعیت کیا تھی، اسی طرح مرزا غالب کی حیثیت علامہ شبلی کی نظروں میں کیا تھی، اور غالب اور ان کے فن کو علامہ کس نگاہ سے دیکھتے تھے، ان موضوعات پر مستقل مقالات کتاب کا حصہ ہیں جس میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ معلومات جمع کی گئی ہیں اور سیر حاصل بحث کی گئی۔

ایک اہم مقالہ عطیہ فیضی اور علامہ کے روابط سے متعلق ہے، عطیہ فیضی ممبئی کے معروف تاجر حسن علی آفندی کی صاحبزادی ہیں جن کی مستقل سکونت ترکی میں تھی اور علامہ کے ترکی کے سفر میں ان سے ملاقات ہوئی اور مخلصانہ تعلق میں بدل گئی، وہ بہت ذہین، وذکی اور دانشمند تھیں، علامہ شبلی پاؤں کے علاج کے لیے ممبئی آئے تو عطیہ سے ملاقات ہوئی، علامہ نے ان پر علمی توجہ مرکوز کی، اور ان کی ادبی واسلامی اعتبار سے تربیت کی، اس سلسلے میں دونوں کے درمیان مراسلت ہوئی، علامہ کے معاصرین میں مولوی عبدالحق شروع ہی سے شبلی کی کردار کشی کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، شبلی کے انتقال کے بعد منشی امین زبیری نے علامہ کے خطوط جو عطیہ فیضی کے نام تھے انہیں جمع کیا اور مقدمہ مولوی عبدالحق سے لکھوایا انھوں

نے شبلی وعطیہ کے متعلق ان خطوط کی بنیاد پر معاشقہ کی داستان اڑائی پھر اس کے بعد متعدد حریفان شبلی نے مزید اس موضوع کو ہوا دے کر شبلی شکنی میں شریک ہوئے ،انہیں میں ایک نام نثر نگار نصر اللہ خان کا بھی ہے جنھوں نے اسی بے بنیاد داستان پر افسانہ طرازی کی ہے۔

ڈاکٹر الیاس اعظمی صاحب نے پوری تحقیق اور دلائل کی روشنی میں اس افسانہ طرازی کی قلعی کھول کر یہ ثابت کیا ہے یہ تمام داستان تنقیصی جذبات کے تحت وجود میں لائی گئی ہے،اور شعوری طور پر شبلی شکنی کی کوشش ہے،حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ کتاب مختلف مقالات ومضامین کے حوالے سے ماضی قریب کے شیخ الحدیث شیخ یونس جونپوریؒ کی نظر میں شبلی کی عظمت،شبلی نیشنل کالج اعظم گڈھ کی تاریخ وکارنامے،انجمن حمایت الاسلام لاہور کے پلیٹ فارم سے علامہ کی ملی وادبی اور مذہبی خدمات،علامہ کے نو دریافت خطوط کی معلومات،علامہ شبلی اور کلکتہ شہر کے درمیان ربط وتعلق اور اس حوالے سے وقف علی الاولاد کی عظیم الشان خدمات اور جہان شبلی کی معلومات اوران کے متعلق وقیع اور جلیل القدر آگہی کا سرمایہ فراہم کرتی ہے، آخر میں مطالعہ شبلی کے چند زاوئے ،،کے عنوان سے بڑا اہم مضمون اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے شامل کیا ہے، اس مضمون سے جہاں شبلی کی کثیر الجہات اور عبقری شخصیت سامنے آتی ہے وہیں مطالعہ شبلی کے اکیس پہلوؤں کا تذکرہ کرکے ان　کی طرف اہل نظر اور اہل دانش کی توجہ بھی مبذول کرکے تشنہ موضوعات کی تحقیق وتنقید اور تشریح کی دعوت بھی دی ہے مثلاً حیات شبلی کے بعد سوانح شبلی کے متعلق نئی معلومات کا تحقیقی جائزہ، تصانیف شبلی کے سلسلے میں مزید مطالعہ وتحقیق،شبلی کی تحریروں کی جمع وترتیب اوران کے محققین ومصنفین کا تجزیہ،افکار شبلی کا مطالعہ وتجزیہ نئے تناظر میں، مقالات شبلی کی آٹھوں جلدوں کی ایڈیٹنگ، پوری ایک صدی پر مشتمل شبلی کی علمی، دینی ادبی اور تاریخی فتوحات پر وجود میں آنے والی کتابوں اور مقالات ومضامین کا تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ،تصانیف شبلی کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں کا جائزہ،شبلی کی اردو فارسی کلیات کی تدوین نو،علامہ کے نظریہ تعلیم اوران کے وضع کردہ تعلیمی نظام کا تجزیہ،اساتذہ شبلی وتلامذہ شبلی

کے درمیان فکر ونظر کے لحاظ سے اثر پذیری کے تذکرے، شبلی کی کتابوں کے تراجم، مکاتیب شبلی کے متن کی تشریح وتصحیح، تاریخوں کی تعیین، شبلی کے اسفار کی تحقیقات، دریافت، وغیرہ۔

حاصل یہ کہ نقوش شبلی علامہ شبلی کے افکار ونظریات، ان کی علمی وفکری بلندی، ان کی متنوع علمی، دینی تحقیقی، تاریخ، سوانحی اور ادبی وشعری جہانوں سے قارئین کو جہاں روشناس کراتی ہے وہیں وہ شبلی کی متعدد جہتوں اور نئے نئے گوشوں سے متعلق علم وآگہی کی دولت بخش کر مطالعہ کے مسافر کے لئے شبلی شناسی کی کشادہ راہ ہموار کرتی ہے۔

حسب سابق یہ کتاب بھی باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن وجمال سے آراستہ ہے، سرروق سادہ مگر نفیس کلر سے مزین ہے، کتابت پاکیزہ صاف اور ستھری ہے کاغذ بھی قیمتی اور معیاری ہے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین

آپ کے خطوط

السلام وعلیکم

محترمی مفتی مولانا شرف الدین قاسمی صاحب: ابھی ابھی "الماس" کے دوسرے شمارے کا مطالعہ کیا۔ آپ نے غلامِ مصطفی، اس خاکسار کی نعتِ شریف کو اپنے رسالے میں سرِ فہرست شائع کر کے جو عزت بخشی ہے، اس کے لئے میں آپ کا مشکور و ممنون ہوں۔ آپ کے پہلے شمارے کی طرح اس ماہ بھی تمام مضامین کا معیار نہایت اعلی درجے کا ہے۔ اسلوبِ زبان اور دلکش اندازِ تحریر قاری کو صفحۂ قرطاس سے جکڑے رکھتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ سے لے کر معلوماتی دینی مضامین اس ماہنامے کو چار چاند لگا رہے ہیں۔ آپ کے مضامین پڑھکر مضمون نویسی میں الفاظ کی بندش اور اردو زباں کی چاشنی کا لطف آتا ہے۔ یہ رسالہ یقیناً اردو ادب و صحافت کا بہترین نمونہ ہے۔ اللہ تعالی مدیرانِ الماس کو اس کی جزائے خیر عطاء کرے۔
آمین یارب العالمین

قاضی سراج اطہر صاحب
پروفیسر یونیورسٹی امریکہ

☆☆☆☆☆

آپ جیسے صاحب طرز ادیب کی ادارت اور قلم کے دھنی مولانا حفظ الرحمن الاعظمی صاحب کی معاونت میں نکلنے والا یہ ماہانہ برقی مجلہ الماس زبان وادب کی تمام تر خوبیوں سے مالا مال ہے عناوین کا تنوع، ملک کے مستند صاحب قلم کی تحریریں الماس کے معیاری اور باوقار ہونے کی علامت ہیں۔ الماس میں وہ سب کچھ ہے جو کسی بھی علم وادب کے پیاسے کی تشنگی رفع کرنے کے لئے ضروری ہے ... اپنی زندگی کے دوسرے ہی سفر میں اس کی اٹھان قابل دید ہے۔ جو اس کے مدیران کی علمی وادبی قابلیت وصلاحیت کی علامت ہیں ... پی ڈی ایف والی

تحریر جلدی نہیں پڑھتا لیکن الماس کو پڑھنے پر مجبور ہوا کیونکہ یہ مولانا شرف الدین صاحب کی ادبی وقلمی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو ہر طرح کے حشو وزوائد سے پاک صرف مغز ہی مغز ہے۔۔دعا ہے کہ زبان وقلم،علم وادب کا یہ صحافتی سفر اسی اب وتاب کیساتھ رواں دواں رہے۔۔دلی خواہش ہے کہ الماس برق وشرر سے سے آگے نکل کر کتابت وطباعت کی دنیا آباد کرے تاکہ افادیت عام اورتام ہو۔

مولانا محمد خالد اعظمی مدیر پاسبان علم وادب (واٹس ایپ گروپ)

☆☆☆☆☆

گرامی قدر مفتی شرف الدین عظیم قاسمی زید مجدہ،عزیزم مولانا حفظ الرحمن قاسمی سلمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الماس کا دونوں شمارہ پڑھا،آپ لوگوں کے لیے دل سے دعائیں نکلیں مادیت کے اس دور میں جب انسان کا ہر قدم معاش کے واسطے ہی سے اٹھتا ہو علم وادب کا چراغ روشن کرنا اوراس کی چمک سے گرد وپیش کو جگمگا دینے کی ہمت کرنا آپ لوگوں کے لیے یقیناً نیک فال ہے۔

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ

آپ لوگوں کی اس کاوش پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد اور نیک خواہشا تمضامین میں تنوع ہے،علم وادب ہے،فکر ونظر ہے،معلومات کا ذخیرہ بھی اورغور وفکر کے لیے راستہ بھیعید قرباں پر مفتی عبید اللہ شمیم کی تحریر، اتحاد اسلامی پر مولانا شکیل منصور کا مضمون،متعلقات قرآن پر سمیہ ریاض کا معلوماتی مقالہ دلچسپ بھی ہے اور فائدہ مند بھی ''انا کے سائے''،''پیر کا خوف'' دل کی آواز بھی ہے اور دل تک پہونچنے کے انداز میں لکھی بھی گئی ہےتعلیم اور مسئلہ فلسطین مسلمانوں کے سب سے بڑے مسائل میں سے ہےجس پر دقت نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتابیات پر لکھی ہوئی کوئی بھی تحریر ہم جیسے طالب علموں کے لیے بڑی قابل قدر چیز

ہوتی ہے مدیر محترم کا تعارف وتبصرہ اور معاون مدیر کی تحذیر الناس پر خامہ فرسائی۔

کرشمہ دامن دل می کشد کی جا ایں جا است

حضرت الاستاذ مرحوم پر نمبر نکالنا ایک مستحسن اقدام ہے لیکن صبر آزما خدا کامیاب کرے لکھنے کا سلیقہ نہیں، لیکن دوستوں کا حق ہے کہ ان کی کوششوں کو سراہا جائے سمع خراشی پر معذرت۔

سلمان احمد اعظمی مقیم بھیونڈی

☆☆☆☆☆

محترم ومکرم شرف الدین عظیم قاسمی صاحب

بہت عمدہ مضامین سے مزین ماہنامہ الماس زیر۔مطالعہ آیا۔ایک سے بڑھ کر ایک مضمون ہے۔آپ کی تمام تحاریر کا مطالعہ بغور کیا، (آپ کی تحاریر کو بڑے شوق سے پڑھتا ہوں) کیا کہنے، الحمدللہ۔

آئینۂ ایام کے تحت عیدالاضحیٰ کا پیغام اور حالات۔حاضرہ پر فٹ بال کھلاڑی رونالڈو کا ظالموں کے خلاف خاموش احتجاج عبرتناک تحریر رہی، انا کے سائے مجھے یہ تحریر بے حد پسند آئی اس میں الفاظ کا استعمال، جملوں کا دروبست، دلکش اسلوب میں ناصحانہ اور حکمت کی باتیں، بہت خوب بہت خوب۔ماشاءاللہ مسئلۂ فلسطین مضمون میں ہمام احمد صدیقی صاحب نے فلسطین کی مکمل تاریخ عام فہم زبان میں عمدہ طریقے سے پیش کی ہے۔ڈاکٹر سراج اظہر کی نعت۔پاک عشق۔احمدی میں ڈوب کر کہی ہے سبحان اللہ۔۔نائب مدیر مولانا حفظ الرحمان صاحب کی اپنی بات دل کو چھوگئی۔کتنے حقیقت پسند اور حق گو اور بے باک احباب ہو آپ لوگ ماشاءاللہ ۔۔۔ماہنامہ کے دیگر قلم کاروں کے مقالات و مضامین بھی عمدہ اور معلوماتی رہے۔دینی معلومات کے ساتھ ساتھ ادب پسندوں کا اس ماہنامہ میں خاص خیال رکھا گیا شکریہ۔میں آپ سمیت ماہنامہ الماس کے جملہ ذمہ داران اور سرپرست نیز تمام قلمکاروں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، دعاگو ہوں کہ اللہ آپ تمام کو صحت وتندرستی عطا فرمائے ءبالخصوص مولانا

سرفراز احمد صاحب کو جلد از جلد شفاء کاملہ عطا فرمائے۔ آمین یا الرحم الراحمین

احمد نداف ٹیچر شعبہ اردو کرناٹک

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ

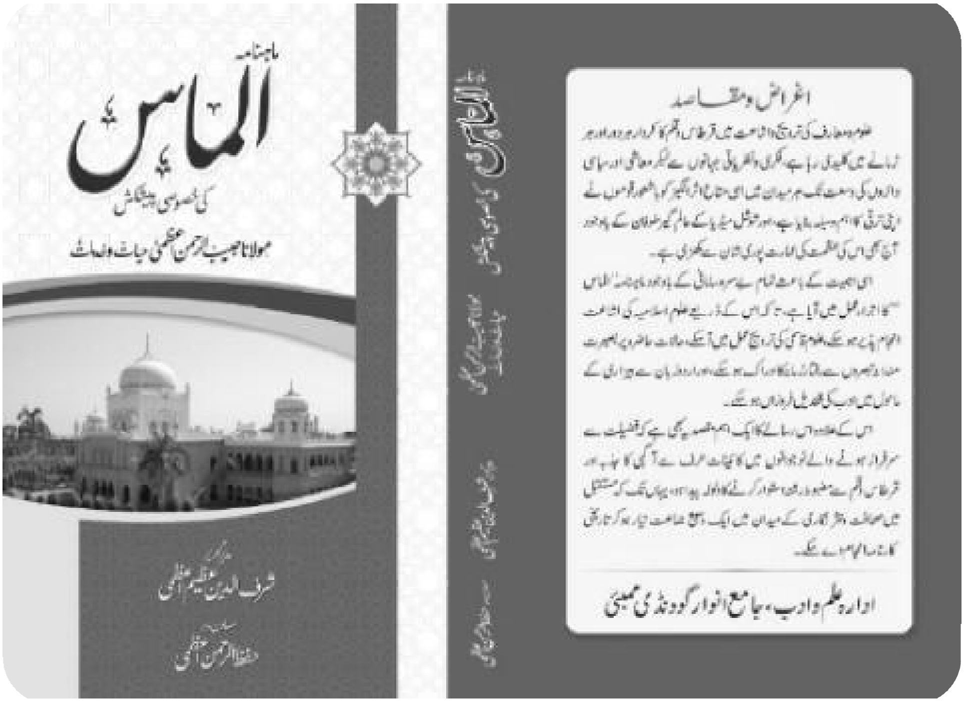
کیسے ہیں مزاج!

کل تم نے رسالہ ''الماس'' بھیجا۔سردست اس پر فقط ایک سرسری نگاہ ڈالی پھر بھی آنکھیں خورسند ہوگئی تھیں البتہ آج مکمل رسالہ سے استفادہ کیا اور قلب و روح میں غذا اور مسرت حاصل ہوئی ۔واقعی رسالہ خالص علمی فکری تحقیقی و ادبی محسوس ہوا ۔اور گرانقدر متنوع مشمولات علمی مضامین اورادبی مقالات کی چاشنی دل ودماغ کو خاصا متاثر کیا۔

غرضیکہ ہر زاویہ سے رسالہ خوب سے خوب تر اور جاذب قلب ونظر ہے اور جملہ معاونین بالخصوص تمہارے اعلی علمی ادبی تحقیقی وفکری ذوق وجذبہ کا نمایاں شاہکار اور واضح کرشمہ ہے۔ جملہ نگارشات مفید بامقصد اور نہایت وقیع ہیں۔

ہر مضمون بلکہ مضمون کی ہر ہر سطر رسالہ کے بلند وقار اور اعلی معیار کی غماز ہے۔امید ہے کہ یہ رسالہ بہت تیز گامی سے دنیائے علم وادب میں اپنا منفرد وقار بنانے میں کامیاب ہوجائے گا اور قدر وعظمت میں اپنا اچھوتا مقام جلد حاصل کر کے جادہ حق میں آوازہ حق کا بلند مینار ثابت ہوگا ۔دل سے دعاء ھے کہ اللہ تعالی اس رسالہ کو ہر مرحلہ کی مشکلات سے ناآشنا اور ہر منزل کی دشواریوں سے رستگاری فرماتا رہے اور اسے شرف قبول عطاء کر کے مفید عام وخاص بنائے۔آمین یارب العالمین۔

خیرخواہ وخیر اندیش
منظور احمد قاسمی بھیروی
جامعہ عزیزیہ،سہریا نظام آباد اعظم گڑھ
۲۰/ذیقعدہ ۱۴۴۲ھ بروز جمعہ


ماہنامہ
الماس
کی خصوصی پیشکش
مولانا حبیب الرحمن اعظمی حیات وخدمات
اغراض ومقاصد
ادارہ علم وادب، جامع انوار گونڈی ممبئی